جہانِ غالب

5

جہانِ غالب

یادگارِ حکیم عبدالحمیدؒ

جلد سوم   شمارہ—5

نگراں

خواجہ حسن ثانی نظامی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگارِ حکیم عبدالحمیدؒ

جلد دوم : شمارہ: پانچ دسمبر 2007 تا مئی 2008

قیمت فی شمارہ: =/20روپے

قیمت سالانہ: =/40روپے

ڈاک سے: =/50روپے

کمپوزنگ : علیزہ کمپیوٹر سنٹر، کبیر نگر، دہلی۔

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری، غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔۱۱۰۰۱۳

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے ایم۔آر۔ پرنٹرس، نئی دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست
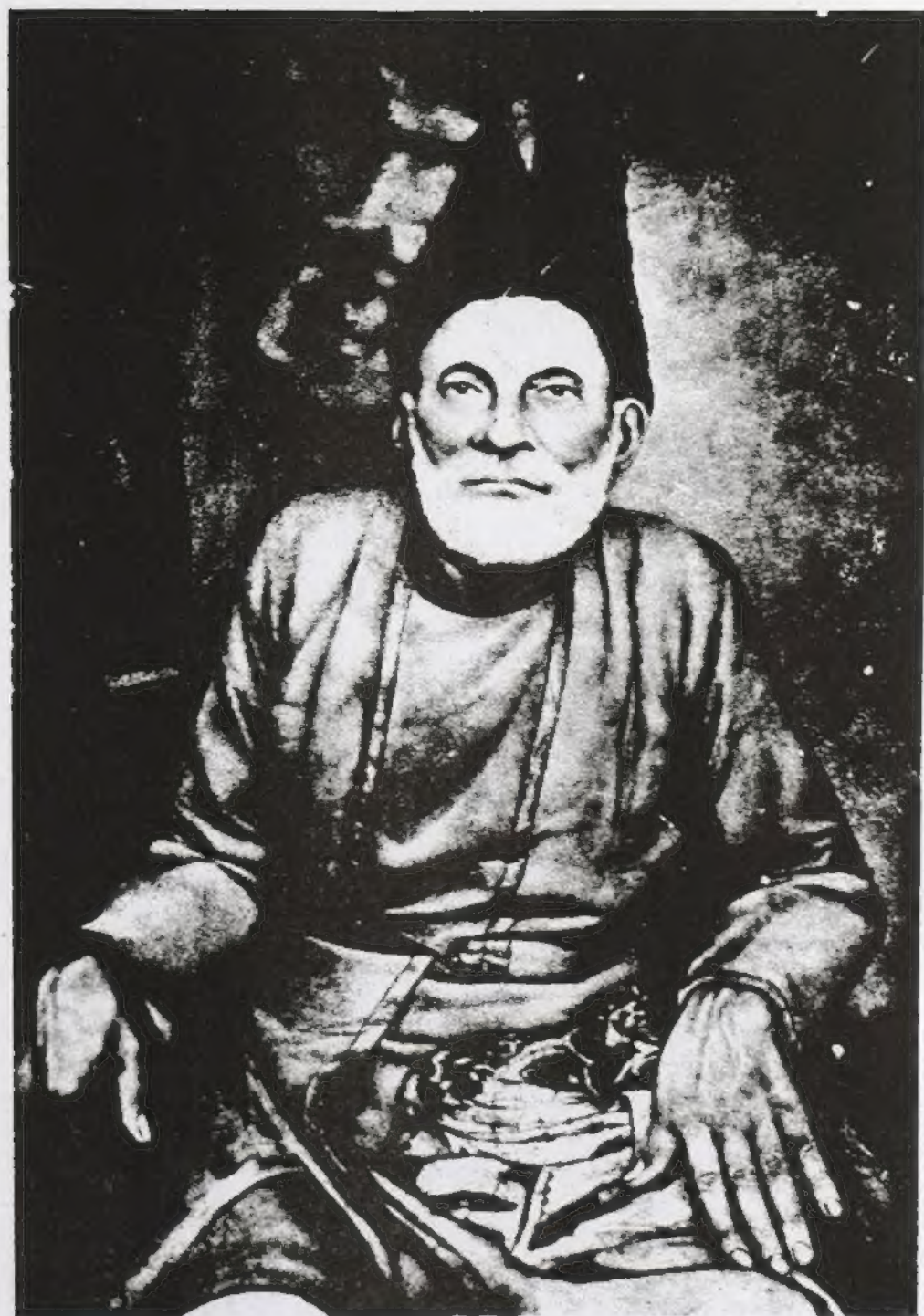
اس شمارے کے بارے میں

جہان غالب کے چاروں شمارے پسند کیے گئے، پانچواں شمارہ حاضر خدمت ہے۔ یہ 2008 کا پہلا شمارہ ہے۔ 2008 غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالمجیدؒ کی پیدائش کا سواں سال ہے۔ حکیم عبدالحمیدؒ کی شخصیت کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ان کی ساری زندگی ملک وقوم کی خدمت میں گزری۔ غالب اکیڈمی کے ساتھ ہی ہمدرد یونیورسٹی، ہمدرد پبلک اسکول، رابعہ گرلز پبلک اسکول اور دوسرے بہت سے ادارے حکیم صاحب کے قائم کردہ ہیں۔ جن سے سارا ملک فیضیاب ہورہا ہے۔ اس شمارے کا پہلا مضمون حکیم عبدالحمیدؒ کا مختصر خودنوشت ہے۔ اکیڈمی حکیم صاحب پر جلد ہی ایک کتاب علاحدہ سے شائع کررہی ہے۔

اس شمارے کا دوسرا مضمون پروفیسر شکیل الرحمٰن کا جمالیات غالب، سائیکی ڈرامے کا آتشیں کردار ہے جو غالب کے استاد ملا عبداصمد کے بارے میں ہے۔ مختلف محققین کی آرا پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر شکیل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''ہرمزد (ملا عبدالصمد) غالب کے ہمہ گیر لاشعور اور ان کے جذبہ واحساس کی تصویر تھا۔ ان کی شخصیت کا ایک آئینہ۔ نرگسی مزاج مجرد جمالیاتی جہان نے اس پیکر کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا تھا۔''

تیسرا مضمون ڈپٹی نذیر احمد کی نثر نگاری ان کے ناولوں کے حوالے سے ہے جسے پروفیسر الطاف احمد اعظمی صاحب نے ''غالب اور ان کے معاصرین کی نثر نگاری'' پر ''سیمینار'' میں پڑھا تھا۔ نذیر احمد غالب کے معاصر تھے اور بعض ناول غالب کی حیات میں

تصنیف کیے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے اردو خطوط نگاری میں جو روش اپنائی تھی اس کا اثر اردو کی دیگر نثری اصناف میں ظاہر ہونے لگا تھا۔

2007 میں 1857 کی ایک پچاس سویں سالگرہ بڑے دھوم دھام سے منائی گئی ظاہر ہے یہ واقعہ بھی غالب کے ہی عہد کا ہے۔ غالب تنہا شاعر ہیں جنہوں نے 1857 سے پہلے کی دلی دیکھی اور 1857 میں دلی میں ہی رہے اور 1857 کے بعد اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔ اس سلسلے کے دو مضامین شامل اشاعت ہیں پہلا مضمون ڈاکٹر اوصاف احمد کا 1857 کے واقعات اور غالب دستنبو بنام غالب کے خطوط ہے۔ دوسرا مضمون جناب وسیم احمد سعید کا ہے جس کا عنوان انقلاب 1857 بہادر شاہ ظفر اور غالب ہے۔

غالب کے سوانح عمریوں میں غالب کے اسفار کا ذکر کم ملتا ہے۔ ڈاکٹر اکبر علی ترمذی (مرحوم) نے اپنی کتاب نامہ ہاے فارسی میں غالب کے سفر باندہ کے بارے میں لکھا ہے باندہ کے جناب احسان آوارہ صاحب نے اس سے اختلاف کیا اور اپنا ایک مضمون ہمیں ارسال فرمایا ہے وہ شامل اشاعت ہے۔

غالب اپنی فارسی شاعری اور فارسی دانی پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔ لیکن فارسی کے اصل مرکز ایران میں غالب کو ان کی خواہش کی مطابق پذیرائی نہ مل سکی۔ لیکن عہد حاضر میں اب ایران میں بھی ان پر کام ہو رہا ہے اس سے متعلق ایک معلوماتی مضمون عہد حاضر کے ایران میں غالب کی شناخت شہناز پروین کا ہے۔

ان مضامین کے ساتھ حسب معمول کتابوں کی باتیں۔ اکیڈمی کی سرگرمیوں کی مختصر رپورٹ پیش خدمت ہے اس امید کے ساتھ کہ یہ شمارہ بھی پسند کیا جائے گا۔

اس شمارے کے قلم کار حضرات:

1. پروفیسر شکیل الرحمٰن، مادھوبن اے 267 ساؤتھ سٹی گڑھ گاؤں
2. پروفیسر الطاف احمد اعظمی، آر۔زیڈ 901 پلاٹ نمبر 402 تغلق آباد ایکسٹینشن نئی دہلی
3. ڈاکٹر اوصاف احمد، بی 89 سیکٹر 27 نوئیڈا
4. جناب وسیم احمد سعید، 205 سی بابر روڈ نئی دہلی
5. جناب احسان آوارہ، باندہ
6. محترمہ شہناز پروین، 1356 کلاں محل دریا گنج نئی دہلی

حکیم عبدالحمید

خودنوشت

میری تاریخ پیدائش کچھ غیر متعین سی ہے۔ میرے پاسپورٹ میں کسی طرح 25/ اگست 1908ء درج کردی گئی تھی لیکن جب ایک بار میری خالہ فاطمہ نے بتایا کہ میں شب برات کے دوسرے یا تیسرے دن پیدا ہوا تھا تو میں نے تاریخ کی تحقیق کی۔ اس کے مطابق 17/ شعبان 1326ھ کو 14/ ستمبر 1908ء پیر کا دن نکلا۔ پیر کے دن سے میرا چونکہ ہمیشہ سے لگاؤ رہا ہے اس لئے میں نے اوپر درج کردہ تاریخ پیدائش سمجھ لی گرچہ پاسپورٹ میں 25/ اگست ہی درج چلی آرہی ہے۔

میری پیدائش اس چھوٹے سے ایک دالان والے مکان میں ہوئی جو شاید اب بھی موجود ہے اور ہمارے خاندان کے بڑے سے مکان اور حاجی قمر الدین صاحب تاجر چرم کے مکان کے درمیان واقع ہے۔ غالباً والد صاحب شادی کے بعد اسی مکان میں آگئے تھے۔ غالباً ہماری آپا جان حمیدہ بیگم بھی جو مجھ سے تین سال بڑی ہیں اور بفضلِ خدا اب بھی ہمارے درمیان ہیں، یہاں ہی پیدا ہوئی ہوں گی۔

غالباً 1910ء میں ہمارا خاندان اس مکان میں منتقل ہوا جو گلی میڑھو حلوائی میں

ہے۔ یہ مکان دو کوٹھریوں اور ایک دالان اور صحن اور اس سے آگے دروازہ تک کا راستہ اور دروازے کے سامنے پاخانہ اور پاخانہ کی دیوار کی پشت پر ایک چبوترہ جو غسل خانہ کا کام دیتا تھا۔ اس مکان کے اوپر ایک کمرہ اور صحن تھا جسے والد صاحب نے ہمارے ماموں حاجی بابو فضل الٰہی کو دے رکھا تھا۔ اور شادی کے بعد ہماری ممانی نھو بیگم بھی یہاں رہتی تھیں جو بالکل ہی مختلف مزاج کی تھیں، جب کہ ان کے شوہر حاجی بابو فضل الٰہی اور والد صاحب کے تعلقات ایسے تھی کہ دونوں گھی شکر تھے۔ ہر کام میں مشورہ۔ دسویں تک پڑھنے کی وجہ سے انگریزی سے واقفیت، اس لئے ہمدرد کی انگریزی خط و کتابت میں مددگار۔ ''خان'' والد صاحب کا دیا ہوا خطاب تھا۔ کیونکہ وہ والد صاحب کے ہر کام میں آگے آگے رہتے تھے۔ سفر میں وہ ہمیشہ اپنے خان کے ساتھ جاتے تھے۔ کلکتہ کے سفر کی کیفیت جو خان صاحب کی زبانی معلوم ہوئی وہ بھی بڑی دلچسپ ہے، غالباً والد صاحب کا ہاضمہ سفر کے دوران چست و چالاک ہو جاتا تھا۔

جب میں چار سال کا تھا 1913ء میں خسرہ اور بخار میں مبتلا ہونا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ والد صاحب اور والدہ سخت پریشان تھے۔ والد صاحب میرے پاس بیٹھ جاتے اور پیٹ اور کمر سہلاتے رہتے تھے۔ ایک اور تقریب (1913) ختنوں کی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس کے لئے ہماری پڑوسن خالہ محمدی کے مکان کی ایک دیوار گرانی پڑی تاکہ مہمانوں کے لئے گنجائش نکالی جاسکے۔ ختنہ جراح خاندانی سمیع اللہ صاحب نے کیا تھا۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے وہ گوناگوں رہی۔ سب سے پہلے 1913ء میں مدرسہ نعمانیہ میں داخل کرایا تھا۔ جس کے بانی پھاٹک حبش خاں میں رہنے والے مولوی

عبدالرشید اور مہتمم معاون مولانا عبدالمجید تھے۔ اچھا خاصا مدرسہ تھا۔ تقریبات بھی ہوتی رہتی تھیں۔ اس مدرسہ میں قرآن وحدیث کا درس بھی ہوتا تھا جس میں افغانی اور سرحد کے طلباء ہی ہوتے تھے اور درس بھی وہی دیتے تھے۔ ایک سال کے بعد جب میں دوسری جماعت میں گیا تو اس کے استاد یا ماسٹر صاحب نے مجھے تختیوں کی اصلاح کے لئے بٹھادیا کیونکہ میرا خط جماعت کے سب بچوں سے اچھا تھا۔ دو سال کے بعد 1915ء میں مجھے چوڑی والان کے اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ یہاں کے دو تین استاد مجھے اب تک یاد ہیں اور جن سے بعد میں بھی تعلقات رہے۔ انگریزی کی کمی پورا کرنے کے لئے مجھے ماسٹر عزیز اللہ بیگ صاحب (جو اینگلو عربک اسکول میں ٹیچر تھے) کے پاس بھیجا جاتا رہا۔ لیکن یہ سلسلہ دو تین ماہ ہی رہا۔ پھر معلوم نہیں کیوں چھٹی جماعت سے مجھے اینگلو عربک اسکول میں داخل کرادیا گیا (1918)۔ 1919ء اور 1920ء میں سیاسی آندھیاں چلنی شروع ہوئیں۔ ترک موالات میں اسکول اور تعلیم بھی لپیٹ میں آگئے تو اینگلو عربک کالج کی تعلیم بھی ختم ہوئی۔ کچھ مدت تک فارسی کی تعلیم کے لئے مولوی نصیرالدین صاحب کو متعین کیا گیا، جنھوں نے آمدنامہ سے کام شروع کرایا۔ پھر کریما، گلستاں اور بوستاں کا نمبر آیا۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہر دو سال کے بعد اسکولوں کی تبدیلی کیوں ہوتی رہی۔

تعلیم کا ذکر چل رہا ہے تو اس کو آخر تک پہنچا دینا چاہیے۔ 1922ء میں والد صاحب کی رحلت کے بعد ماموں حافظ نور صاحب نے طب کی تعلیم پر توجہ کی۔ حکیم عبدالرحمٰن صاحب جو ہمدرد کے خیر خواہوں میں تھے اور طبیہ کالج دہلی میں استاد بھی تھے، انھوں نے ذمہ لیا کہ وہ گھر پر طب کی تعلیم دے دیں گے اور سند بھی دے دیں گے۔ چند ماہ کے بعد اس گھریلو پڑھائی سے مجھے اطمینان ہوا اور نہ ماموں صاحب کو۔ آخر میں 1925ء

کے آخر میں طبیہ کالج میں داخلہ کا فیصلہ ہوا اور میں نے باقاعدہ کلاسوں میں جانا شروع کردیا۔ اس وقت استاد بھی پایہ کے تھے جیسے حکیم کبیر الدین صاحب، حکیم ڈاکٹر فضل الرحمٰن ٹونکی، حکیم الیاس خاں، حکیم استاد قانون، حکیم فرید احمد عباسی امروہوی، استاد معالجات اور پرنسپل تھے۔ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن بہاری وغیرہ۔ تین سال تک طب کی تعلیم کا یہ سلسلہ خیر و خوبی سے چلتا رہا۔ تیسرے سال سالانہ امتحانات ہوئے تو میں نے یہ ''سختی'' سے محسوس کیا کہ فلاں مضمون میں میرے نمبر بہت کم ہیں حالانکہ میں نے اپنے خیال میں پرچہ بڑا تفصیلی کیا تھا۔ اس زیادتی کی فریاد میں نے خود مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ تک پہنچائی اور چار پانچ گھنٹے میں نے ان کے مطب میں گزارے اور بڑے غور سے مطب کے طریقوں اور مریضوں سے برتاؤ کا مطالعہ کرتا رہا۔ مجھے یہاں تسلیم کرنا چاہیے کہ اپنے مطب کی زندگی پر جو 1931ء سے شروع ہوئی، ان پانچ گھنٹوں کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ اس کا اثر زندگی بھر مجھ پر رہا۔ نمبروں کی کمی کے سلسلہ میں مسیح الملک نے فرمایا کہ کالج کے معاملات میں میرا دخل مناسب نہیں ہے، پھر بھی میں دیکھوں گا۔ اس واقعہ یا حادثہ کے بعد میری طبیعت کچھ ایسی اچاٹ ہوئی کہ میں چوتھے یعنی آخری سال طبیہ کالج نہیں گیا اور یہ تعلیم ''ادھوری'' رہ گئی جو بعد میں معلوم نہیں کس کس طرح پوری ہوئی۔ شاید طالب علمی کی یہ کیفیت میری تمام زندگی میں طاری رہی اور اس کے جو نتیجے بھی ہوئے وہ تاریخ کا حصہ ہیں اور ہمدرد کی تاریخ لکھنے والے اس پر روشنی ڈالتے رہیں گے۔

والد صاحب کی رحلت کے بعد تعلیم کے ساتھ ساتھ میرے جو مشاغل رہے اور صبح سے رات تک جو مصروفیتیں تھیں، ان کا کچھ نقشہ برادر عزیز حکیم محمد سعید نے اپنی ''سوانحی تحریروں'' میں کھینچا ہے اور ہمدرد اور کاروبار ہمدرد کیسی کیسی آزمائشوں سے گزرا ہے، اس پر برادر عزیز لکھتے رہے ہیں اور آئندہ لکھنے والے لکھتے رہیں گے۔

اپنی گیارہ سال کی عمر سے ہی میری زندگی ''ضابطوں'' میں رہی۔ نماز، روزہ کی پابندی اس حد تک کہ تہجد تک کی نوبت آگئی۔ جمعہ کے دن والد صاحب کے ساتھ مدرسہ حسین بخش یا جامع مسجد میں نماز ادا کرنا، پھر دریبہ کلاں کی طرف رخ کرنا اور نظام الدین کے کتب فروش کی دکان پر دم لینا اور حکیم اعظم خان اور مولانا شبلی کی جو بھی اچھی کتاب ملتی، اسے خریدنا معمول سا تھا۔ حکیم اعظم خاں کی مطبوعات کے لئے ایک خاص الماری خریدی گئی ہے، جواب تک محفوظ ہے اور مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان اور سفرنامۂ مصر وشام شاید اب بھی برادر عزیز کے کتب خانہ میں محفوظ ہوں۔ والدہ کی رحلت کے بعد میں نے ان کتابوں کی پوری حفاظت کی۔ بعض کی جلدیں بندھوائیں اور ان کو باقاعدہ موٹے کاغذ سے محفوظ کیا۔

میرا یہ معمول بھی مدتوں رہا۔ والد صاحب کی زندگی ہی میں کہ کشمیری گیٹ کے بڑے ڈاک خانہ سے ڈاک پوسٹمین سے لے لینا اور اسے فوراً دفتر ہمدرد پہنچانا، جہاں اس پر کام شروع ہو جاتا۔ دفتر کے انچارج قاضی مشرف علی بدایونی تھے جو شروع ہی سے ہمدرد سے وابستہ رہے۔ بیچ میں دو تین سال کے لئے ملایا چلے گئے تھے۔ واپسی پر 1914ء میں پھر دفتر ہمدرد کے انچارج کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جواب طلب خطوط کے جوابات لکھنا اور فرمائشی خطوں کی تعمیل، ان کا ذمہ تھا اور شام کو دواؤں کے پارسلوں کو ڈاک خانہ کے حوالے کرنا۔ اس وقت ڈاک چالیس پچاس خطوں پر مشتمل تھی۔ جس دن ساٹھ یا اس سے زیادہ خطوط ہوتے تو بڑی خوشی ہوتی۔ جوابی خطوں کی نقلیں مجھ سے کرائی جاتی تھیں۔ اس سے مجھے فائدہ پہنچا۔ تجارتی خط لکھنے کا سلیقہ ابتداً آیا اور ہندوستان کے تمام صوبوں اور ضلعوں وغیرہ کے نام، مقام مجھے ازبر ہو گئے، جس سے اب تک فائدہ پہنچ رہا ہے۔

اسی عمر (10) میں نیچے دواخانہ میں جوشاندوں کی پڑیوں کے ڈھیر لگادیتا۔ تیاری یا فرمائشی نسخے باندھنے والوں کو دواؤں کے خانوں میں سے تسلوں دوائیں نکال نکال کر نسخہ بند کو دیتا جس سے دواؤں کی شناخت کے علاوہ ان کے خانے تک یاد ہو گئے۔ کبھی کبھی خریداروں کے لئے نسخہ بندی بھی کر لیتا تھا اور بقول برادر عزیزم حکیم حافظ محمد سعید، جب میں گدی پر بیٹھتا تو خریداروں کا ''تانتا'' بندھ جاتا تھا۔

اب میں چند متفرق باتوں کی طرف آ کر اس ''سوانح'' کو ختم کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بعد کے حالات پر اور اصحاب نے بھی کچھ لکھا ہے اور برادر عزیز نے تو سوانح عمری کا حق ادا کر دیا ہے۔

نماز، روزہ اور دو ڈھائی بجے تہجد کا ذکر تو اوپر آ گیا ہے۔ مسجد گلی شریف بیگ، جو کوچہ کاشغری کے سامنے تھی اور جس کے متولی ہمارے نانا ابا شیخ کریم بخش تھے، ہم نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس پرانی مسجد کی صفائی کا میں اتنا خیال رکھتا تھا کہ ہر ہفتہ وہاں جھاڑو کے علاوہ فرشوں کی دھلائی بھی ہوتی تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد اس مسجد کو از سر نو تعمیر کرایا اور اس میں ایک دو دکانوں کی گنجائش بھی نکالی گئی۔ تعمیر کا یہ کام میری نگرانی میں ہوا اور نواب سائل مرحوم نے اس کی تاریخ بھی نکالی۔

خدا کا گھر بنایا رابعہ بیگم نے ایک

تعمیر کا یہ کام بھی مستری عظیم خاں کے ذریعہ ہمیشہ کی طرح ہوا۔ جب ہم حوض قاضی کے مکان سے کوچہ کاشغری کے مکان میں منتقل ہوئے نومبر 1918ء میں تو میرا بستر اندر کے دالان میں مشرق کی طرف سامان کی کوٹھری کے باہر لگایا گیا۔ پائیتیوں میں ایک طاق تھا جس میں کتابیں وغیرہ رکھ لیتا۔ طاق کے اوپر ایک دن دیکھنے والوں نے

دیکھا چار پانچ کیلیں ٹھکی ہوئی ہیں اور ان کیلوں کے اوپر کاغذ کے لیبل لگے ہوئے ہیں جن پر کرتا، پاجامہ، بنیان اور اچکن وغیرہ لکھا ہوا ہے۔ ترتیب کا مظاہرہ اس عمر (10 سال) میں قابل ذکر ہی سمجھا جائے گا۔ میں نے اپنی پڑھائی کے لئے اس مکان کی پرانی بیٹھک کو چنا۔

گھر سے دواخانہ اکثر والد صاحب کے ساتھ جاتا تھا۔ وہ انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کبھی کبھی جب میں پیچھے ہو جاتا تو میں اپنے قدم وہیں رکھتا تھا جہاں ان کے قدم پڑتے تھے۔ بعد میں یہ ''پریکٹس'' بھی شروع ہوئی کہ جب والد صاحب دواخانہ سے گھر پہنچتے تو میں گھر کے دروازے سے طمنچے میں ''پٹاخہ'' رکھ کر چھوڑ دیا کرتا تھا۔

چوڑی والوں کے مدرسہ میں بعض طالب علم مجھے گھیر لیا کرتے تھے کہ بتاؤ کہ آلو گرم ہے یا سرد یا چنا تر ہے یا خشک۔ میں ان کو چیزوں کے مزاج بتاتا تو وہ بھی خوش ہوتے اور میں بھی اپنے آپ کو حکیم ہی سمجھتا۔

بچپن میں مجھے نزلہ زکام کی شکایت بہت رہتی تھی جس کے لئے ماموں عنایت الٰہی ہسپتال لے جاتے تھے یا نانا ابا حکیم نواب جان صاحب کے ہاں۔ اسی نزلہ کی وجہ سے آدھے سر کا درد بھی اکثر ہو جایا کرتا تھا۔ والدہ صاحبہ ہر روز صبح ہی صبح جوشاندہ پلاتی تھیں لیکن نزلہ زکام جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔

1923ء میں میں نے طبی رسالے ''الحکیم'' اور ''حامی الصحت'' پڑھنے شروع کر دیے۔ عام معلومات طبی کے علاوہ جب ان رسالوں میں ست لوبان یا سلاجیت مصفّی کی ترکیبیں پڑھنے کو ملیں تو میں گھر میں یہ چیزیں بنانے کی کوشش بھی کرتا۔

ان طبی معلومات ہی کی وجہ سے مجھ پر قدرت سے قریب رہنے کا اور قدرتی

علاج کے راز منکشف ہونے شروع ہوئے۔ صبح کی تفریح کا آغاز ہوا جس کا نقشہ برادر عزیز نے اپنے خاص انداز میں کھینچا ہے۔ گرم پانی کو خیر باد کہہ دیا گیا اور ٹھنڈا پانی گرم و سرد موسم کا ساتھی ہو گیا۔ صبح کو ٹھنڈے پانی سے غسل وغیرہ کا ''جہاد'' شروع ہوا۔ دسمبر اور جنوری کی سردی میں جب گھر کے لوگ لحافوں میں دبکے پڑے ہوتے تھے، میں اوپر ٹھنڈے پانی سے غسل کر رہا ہوتا۔ ان ''بے ہنگم'' باتوں کی وجہ سے والدہ صاحبہ مجھے ''جن'' کہنے لگیں۔ اس جن پنے نے نزلہ زکام کو تو بدلتے موسم کا، وہ بھی کبھی کبھی ایک یادگار بنا دیا اور سر کے درد نے پھر منھ تک نہیں دکھایا۔ اب میں سر کے درد کی ''تعریف ذاتی'' بھی نہیں کر سکتا اور وہ کیفیت بھی بیان نہیں کر سکتا جو اور لوگوں کی دردِ سر میں ہوتی ہے۔

نہ نیند کی کمی کا مجھ پر کوئی اثر ہوتا ہے، نہ کاموں کی زیادتیوں کا۔ بس ایک قسم کا بھاری پن شاذ و نادر ہوتا ہے جو معمولی تفریح سے یا آرام کرنے یا ذرا ''قیلولہ'' کرنے سے دور ہو جاتا ہے۔ ابھی حال میں اپریل کے شروع میں اتوار کے مطب کی وجہ سے کراچی سے واپسی رات کے جہاز سے ہوئی جس نے رات کے دو بجے سے ذرا پہلے گھر پہنچایا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے غنیمت رہے۔ نیند آ گئی۔ ساڑھے چار بجے صبح میں سب کام حسب معمول شروع کر دیے اور ناشتہ کے بعد ٹھیک نو بجے مطب پہنچ گیا۔ دو بجے تک مریضوں کی خدمت کرتا رہا۔ دو بجے برادر حکیم اقبال نے خوشامد کر کے مجھے روانہ کیا۔ گھر پہنچ کر نماز پڑھ کر صرف ایک گھنٹے سو کر بالکل تر و تازہ تھا۔

اس ضمن میں یہ بات بتاتا چلوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد (5 سال عمر) سے آج تک ایسا نہیں ہوا کہ سورج نکل رہا ہو اور میں سو رہا ہوں خواہ کوئی حالت مرض ہی کیوں نہ ہو۔

والد صاحب سے متعلق آخر میں دو ایک باتیں اور لکھ دوں تو اچھا ہی ہے۔ کشتہ کے علاوہ وہ گھر میں ابتدائی کام خود کرتے تھے۔ کھرل کرنے میں والدہ صاحبہ یا میں مدد کردیتے تھے۔ ''باغبانی'' کا بھی شوق تھا۔ گھر میں سبزے کے لئے تو جگہ نہیں تھی لیکن پودوں کے گھملے ہی اس شوق کو پورا کرتے تھے یا بعض بیجوں کو اگا کر بہت خوش ہوتے تھے۔ حسب نسل اور شاہ پسند کے گملے مجھے اب تک یاد ہیں۔

آخر میں انھوں نے کارخانہ روغن بادام کی بنیاد ڈالی جس کے سرخ رنگ کے اشتہاری کارڈ چھپوائے اور جو دواخانہ کے لٹریچر میں بھیجے جاتے تھے۔ پتہ یہ تھا۔ ایم۔ ایم۔ اے۔ مجید، کارخانہ روغن بادام، کوچہ کاشغری، بازار سیتارام، دہلی۔ اپنی زندگی میں اس کارخانے کا کام وہی کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد 1926ء تک یہ کام میں نے سنبھالے رکھا۔ پھر میری توجہ تعلیم اور کاروبار ہمدرد پر ہی مرتکز ہوگئی۔

آخر میں والد صاحب کا یہ ''مقولۂ تنبیہی'' دہرادوں تو اچھا ہے، جو انھوں نے ایک بار اپنے دواساز سے کہا تھا۔

''اگر تم نے اپنے کاموں میں ذرا بھی بددیانتی کی تو قیامت کے دن تمھارا گریباں ہوگا اور میرا ہاتھ ہوگا۔''

*****

پروفیسر شکیل الرحمٰن

جمالیات غالب

سائیکی ڈرامے کا ایک آتشیں کردار

غالب نے پس کوچہ سے غیر شعوری طور پر اپنی سائیکی (Psyche) کی جانب اشارہ کیا ہے

مراد لیست بہ پس کوچۂ گرفتاری

کشادہ روے تراز شاہدان بازاری

(قصیدہ دوم در نعت کلیات ص 473)

دل کی عام شاہراہ کے پیچھے ایک ''پس کوچہ'' بھی ہے۔ شعور کی سطح پر المناک تجربوں اور معاشرے کی میکانیت کا اثر شاعر کے دل پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اذیتوں کا شکار رہتا ہے لیکن اسے اس بات کا احساس ہے کہ دل سے لگ کر ایک پس کوچہ بھی ہے، باطن کا پس کوچہ، اتنا کشادہ ہے کہ یہاں رنگ و بو کی دنیا آباد ہوگئی ہے، غالب کی حسن شناسی کی یہ بہت ہی عمدہ مثال ہے، شاعر کے گہرے جمالیاتی وجدان کی ایک پُر اسرار دلکش تصویر ابھرتی

ہے۔ غالب کا جمالیاتی رجحان پھیلتا ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے۔ پس کوچہ پھیل کر کائنات کے حسن و جمال کو جذب کر لیتا ہے۔ صرف یہی نہیں شاعر یہ محسوس کرنے لگتا ہے:

گل جدا ناشد از شاخ بدامان من است

کائنات کے تمام حسن کو سمیٹ لینے کی خواہش بلاشبہ لاشعور یا ''سائیکی'' کے پھیلاؤ کی آرزو کی جانب اشارہ کرتی ہے، غالبیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس صداقت پر ہم نے بہت کم غور کیا ہے کہ شعور، لاشعور کے سمندر میں ایک ننھا سا جزیرہ ہے۔

غالب اپنے باطن میں شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ ان کے وجود میں آتش زرتشت کے شرار چھپے ہوئے ہیں (شرار آتش زرتشت در نہادم بود) اور اس بات پر فخر کرتے ہیں۔

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختہ ای
چون من آزردہٴ آذر نفساں برخیزد!

یعنی آسمان مدتوں چکر کھاتا ہے تب کہیں ایک مجھ سا جگر سوختہ آتش نفسوں کے خاندان سے پیدا ہوتا ہے۔

غالبیات میں ''آتش'' ایک معنی جہت دار آرچ ٹائپ (Archtype) ہے جس سے جانے کتنے استعارات و علامات خلق ہوئے ہیں۔ یہ آرچ ٹائپ ایک ایسا Psychic Force ہے جس سے 'فینومینن' خلق ہوتے رہتے ہیں۔ غالب کی شاعری جب ڈراما بن جاتی ہے تو کئی زندہ اور متحرک کردار وجود میں آتے ہیں، 'سائیکی' متحرک ہو جاتی ہے تو جمالیات بصیرت اور وژن کے ساتھ اس قسم کے تجربے ملتے ہیں:

پیکرم از خاک و دل از آتش است
روشنی آب و گل از آتش است

از بروں سو آبم اما ازدروں سو آتشم
ماہی از جوے سمندر یابی از دریاے من

بینم ازگداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

تخلیق فن کے لمحوں میں اگر تم باطن میں میری حالت دیکھو تو معلوم ہوگا کہ آگ کا ایک سیلاب دل سے جگر تک بہہ رہا ہے۔ آگ کا یہ سیلاب شاعر کی حسّی اور اضطراری کیفیتوں اور تخلیق کے پراسرار عمل کو سمجھا رہا ہے۔ دل سے جگر تک آگ کا یہ سیلاب جمالیاتی تجربوں اور Depth Perception کے تئیں بیدار کر دیتا ہے اس طرح کہ قاری تیسری جہت تک پہنچ جاتا ہے۔ کہتے ہیں:

آتش چکد ز ہر بن مویم اگر بفرض
ذوقم بخود قرار گل و گلستاں دہد

مردنگے سے چنگاریاں اور شعلے نکلیں تو وژن ان سے گلستاں بنالے گا! اور واقعی گلستان بن جاتا ہے:

نگہہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستان مجھ سے

شاعر کے احساس جمال اور نشاطِ جمال کو سمجھنے کے لیے یہ خیال کافی ہے کہ میرے دل سے جو آگ نکلتی ہے اس سے حسن کی تخلیق ہوتی ہے، میرے وجود کی آگ سے حسن کی تخلیق کا عمل جاری ہے۔ یہاں بات صرف یہ نہیں ہے کہ پتھر میں کسمساتے حسن کو سنگ تراش باہر نکالتا ہے۔ بات یہ بھی ہے کہ شرار سنگ لعل کے رخ کا جمال بن جاتا ہے۔

غالب کے پس کوچے میں عجم کا آتشکدہ روشن ہے۔ ہم اسے شعلہ نوائی کی صورت میں پہچانتے ہیں:

سوخت آتشکدہ زآتش نفسم بخشیدند
ریخت بتخانہ زناقوس فغانم دادند

کہتے ہیں آتش کدہ جل بجھ گیا تو کیا میری تقدیر نے مجھے جو شعلہ نوائی بخشی ہے وہ کیا کم ہے۔ بت خانہ ٹوٹ گیا تو کیا میرے حصے میں ناقوس کی سی فریاد و فغاں تو آئی۔ شاہان ایران کے علم کے جواہرات ٹوٹے۔ توڑ لیے گئے، ان کے عوض مجھے گوہر بار قلم تو ملا:

گہراز رایت شاہانِ عجم بر چیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

غالب کے آتشیں جمالیاتی تجربوں کے کیف و اثر کے پیچھے جو طلسمی فکر ہے اور وجدان ارتعاش اور جمالیاتی کیفیتیں ہیں انھیں سمجھنے میں یہ حسی تاثرات اہمیت رکھتے ہیں۔

غالب ایک ہمہ گیر تہہ دار آریائی لاشعور کے مالک ہیں جس کی وجہ سے ان کی فارسی اور اردو شاعری میں کئی "سائیکو ڈرامے" (Psycho Drama) متاثر کرتے ہیں۔ ان کے کردار گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کردار ہرمزد / عبدالصمد کا ہے جس کے متعلق 1969ء میں میں نے لکھا تھا:

''ہرمزد عبدالصمد کے پیکر کی تشکیل علم کی روشنی کی نئی دریافت تھی۔ آئین معنی آفرینی سیکھنے کے لیے غالب نے اپنی سائیکی کے آئینۂ آتشیں سے گفتگو کی تھی۔''

(شکیل الرحمٰن۔غالب کی جمالیات)

مولانا حالی نے تحریر فرمایا ہے:

''مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سن شعور تک آگرے ہی میں رہے۔ اگرچہ سات برس کی عمر سے وہ دلی میں آنے جانے لگے لیکن شادی کے بعد تک ان کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے ان سے تعلیم پاتے رہے، ان کے بعد ایک پارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد تھا اور بعد میں مسلمان ہونے کے بعد عبدالصمد رکھا گیا۔ غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا۔ مرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی''

(یادگار غالب ص 4)

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔''

(ایضاً ص 4)

غالب نے ہرمزد یا عبدالصمد کو تیمسار (زرتشتیوں کے یہاں نہایت تعظیم کا لفظ) کے لفظ سے یاد کیا ہے، مولانا حالی کے یہ جملے ذہن میں رکھیے۔

''ایک شخص پارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانے مین ہرمزد تھا''

(یادگار غالب ص 4)

''اس کو (ہرمزد کو) بلفظ تیمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے یاد کیا ہے''۔ (ایضاً ص 5)

''مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد ان کے مکان پر وارد ہوا''۔

(ایضاً ص 5)

''اس نے (ہرمزد) تمام فارسی زبان کے مقدس اصول اور گرا ور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے اور پارسی و سنسکرت کا متحد الاصل ہونا اور اس قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں تہ نشین کردی تھیں''

(یادگار غالب ص ۵)

غالب نے لکھا ہے:

''بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا، چاہتا تھا کہ فرہنگیوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے بارے مراد برآئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبرآباد کے فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبان پارسی کے معلوم کیے، اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں'' (مکاتیب غالب ص 6)

''لطائف غیبی (غالب نے میاں داد خاں سیاح کے نام سے شائع کی تھی) اور جناب ضیاء الدین کے نام ایک خط میں (بحوالۂ علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر 1949ء) غالب نے ہرمزد کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ یزدکا رہنے والا ہے، سلسلۂ نسب ساسان پنجم سے ملتا ہے، یزد کا امیر زادہ تھا اور جلیل القدر امیر زادوں میں شمار ہوتا تھا، علمائے عرب و بغداد سے پچاس برس تک تعلیم حاصل کی اور مسلمان ہو گیا اور اپنا نام عبدالصمد

رکھا۔ 1226ھ میں آگرہ آیا اور دو برس غالب کا مہمان رہا۔

قاضی عبدالودود صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ غالب نے یہ نہیں بتایا کہ آگرہ کہاں سے آیا تھا اور وہاں سے اس کا کہاں جانا ہوا۔ غالب کے قیام دہلی کے بعد تک اس سے مراسلت رہی اور وہ کبھی کبھی اپنے خط میں اپنا نام عبدالصمد کی جگہ ''اروند بندہ'' بھی لکھا کرتا تھا۔ غالب نے یہ نہیں بتایا کہ 1226ھ میں اس کی کیا عمر تھی لیکن جس شخص نے پچاس برس علمائے عرب و بغداد سے تحصیل علم کی ہو وہ اس وقت 65 برس سے کم کا ہو، یہ قرین قیاس نہیں، زمانہ وفات کی تعین غالب نے نہیں کی لیکن قاطع وغیرہ میں جو الفاظ اس کے لیے استعمال کئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ قاطع (قاطع برہان) کی تصنیف سے پہلے ہی وہ راہی عدم ہو چکا تھا۔ عبدالصمد سے استفادہ کے ببانگ دہل اعلان کے باوجود غالب یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ''مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے، چوں کہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے ان کا منھ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گڑھ لیا''۔ (یادگارِ غالب)

(ہرمزدثم عبدالصمد مطبوعہ احوال غالب۔ مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین احمد 1953ء)

قاضی صاحب کی تحقیق کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا، انہوں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہرمزد یا عبدالصمد خارجی وجود نہیں رکھتا تھا، ان کے دلائل ٹھوس ہیں اور ان کے مقالے سے غالب کے مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ جناب مالک رام نے قاضی صاحب کی تحقیق کو چیلنج کرنے کی ایک ناکام کوشش کی ہے (دیکھئے 'ذکر غالب' چوتھا ایڈیشن 1964ء ص 35)۔ حالی کی ایک عبارت سے یہ سمجھنا کہ ہرمزد یا عبدالصمد ایک تاریخی شخصیت ہے اور دوسری عبارت کا یہ مفہوم نکالنا کہ یہ غالب کی شوخی تھی، مناسب نہیں

ہے۔ جناب مالک رام نے تحریر فرمایا ہے:

''یہ واقعہ ہے کہ مرزا غالب کو فارسی زبان سے قدرتی لگاؤ تھا۔ مگر اس ذوق کو چمکایا ملاّ عبدالصمد ایرانی نے جیسا کہ مرزا نے خود لکھا ہے کہ ملا عبدالصمد ایران کے ایک امیر زادۂ جلیل القدر تھے۔ وہ یزد کے رہنے والے اور نسلاً زردشتی تھے اور اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام پر ایمان لے آئے تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا نام ہرمزد تھا۔ وہ 1226ھ (1810۔ 1811) میں سیر و سیاحت کرنے ہندوستان آئے اور اکبر آباد میں وارد ہوئے۔ مرزا غالب کی عمر اس وقت یہی چودہ برس کی ہوگی، مرزا نے انہیں دو برس تک اپنے یہاں ٹھہرایا۔ اور ان سے تعلیم حاصل کی''۔ (ذکر غالب 1964ء ص 35)

(بحوالہ لطائف غیبی ص 25، درفش کاویانی ص 14-13)

آگے فرماتے ہیں:

''ملاّ عبدالصمد کی مادری زبان فارسی تھی اور اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ زردشتی مذہب کے پیرو تھے، چونکہ زردشتیوں کا تمام مذہبی سرمایہ قدیم فارسی زبان میں ہے اس لیے ان کا فارسی زبان کا فاضل ہرنا چنداں تعجب کا مقام نہیں۔ اس کے علاوہ وہ عربی کے عالم بھی تھے۔ انھوں نے مدتوں علمائے عرب و بغداد کی خدمت میں رہ کر علومِ عربیہ حاصل کیے تھے''۔ (بحوالۂ تیغ تیز (غالب) ص 14-13 لطائف غیبی ص 35)

''........ پس گویہ سچ ہے کہ مرزا کی فارسی دانی کا سنگ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں رکھا گیا تھا لیکن اس عمارت کی تکمیل ملاّ عبدالصمد کے چابک دست اور ماہر ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقے پر ہوئی کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ ملاّ عبدالصمد نے ہندوستان سے واپس جانے کے بعد بھی مرزا غالب سے خط و کتابت جاری رکھی''

(بحوالہ درفش کاویانی ص 18 اور یادگار غالب ص 15)

نوائے ادب کے مضمون میں حالی کی ایک عبارت سے اتفاق کرتے ہوئے جناب مالک رام نے یہ فرمایا کہ قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد واقعی ایک تاریخی شخصیت ہے۔ حالی کی دوسری عبارت کا جائزہ لیتے ہوئے جناب مالک رام نے فرمایا ہے:

''جو مرزا کی افتادِ طبع سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ انہیں خلافِ واقع باتیں بنانے میں اور لطیفہ چھانٹنے میں لطف آتا ہے۔ انہوں نے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں یہ چھینٹا اڑایا کہ اجی کون شاگرد اور کہاں کا استاد۔ وہ لوگ مجھے بے استادہ ہونے کا طعنہ دیتے تھے، میں نے ان کے لیے ایک استاد پیدا کرلیا تو جاننے والے اسے بھی ان کے دوسرے لطیفوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ہوں گے۔''

(ملاّ عبدالصمد استاد غالب، نوائے ادب 1952ء ص 73)

ہرمزد یا عبدالصمد کے خارجی وجود کے متعلق جناب مالک رام کی کوئی بات نئی نہیں ہے یہ وہی باتیں ہیں جو غالب اور حالی نے لکھی ہیں دوسری بات یہ کہ مرزا کو خلاف توقع باتیں بنانے اور لطیفہ چھانٹنے میں لطف آتا تھا۔ ان کا یہ کہنا کہ میں نے ایک استاد پیدا کرلیا ہے ایک لطیفہ تھا اور اس سے ان کی شوخ طبیعت کی پہچان ہوتی ہے۔ صرف قیاس آرائی ہی تو ہے۔ اگر یہ لطیفہ تھا یا ان کی شوخی تھی تو استاد کے پیکر کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ اور ان کی شوخی کا ایک ٹھوس پس منظر بھی موجود ہے۔ اس ''حیوان ظریف'' کی راست گفتاری کا جائزہ اس طرح کیوں لیا جائے؟ غالب کی شخصیت اتنی سادہ اور خط مستقیم کی طرح سیدھی نہیں تھی، حالی مرزا کی حق پسندی، راست گفتاری اور لطیفہ گوئی میں الجھ گئے، وہ صرف حیوان ظریف کو پکڑ سکے۔ اس آدمی کی پیچیدہ شخصیت ان کے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ غالب

کی شخصیت پھیلی ہوئی پہلودار اور تہہ دار ہے۔ ان کی ذات خود گنجینہ معنی کا طلسم ہے۔ وہ طلسم الفاظ کے ایک بڑے جادوگر ہیں۔ ان کی سائیکی (Psyche) میں ایتھر کی نغمہ ریز لہریں ہیں۔ ان کے ذہن کے کیمیائی عمل کی پہچان آسان نہیں ہے۔ غالب کے ذہن تک حالی کی رسائی ممکن نہ تھی۔

جناب امتیاز علی خان عرشی نے درست فرمایا ہے:

''مرزا صاحب نے اس بزرگ کا نام عبدالصمد اور سالِ ورود 1226ھ (1812ء) بتایا ہے لیکن برہان قاطع کے ادبی ہنگامے سے پہلے کسی جگہ اس علامہ دہر استاد کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ بحالت جوانی کلکتے میں جو معرکہ پیش آیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ مخالفین کے سامنے ایسے یکتا استاد سے استفادے کا اظہار کرتے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں ملا عبدالصمد خود ان کے ذہن کی پیداوار تو نہیں''۔

(مکاتیب غالب 1949 ص 15)

عرشی صاحب نے حالی کی دوسری عبارت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس بیان سے یہ شبہ حد یقین کو پہنچ جاتا ہے۔ (ایضاً ص 15)

جناب قاضی عبدالودود نے اپنے پرمغز مقالے میں تحریر کیا ہے۔ ''ساسانِ پنجم بھی جس سے غالب عبدالصمد کا سلسلۂ نسب ملاتے ہیں۔ ایک خیالی ہستی ہے۔ ساسان پنجم کا جو نسب نامہ دبستانِ مذاہب میں ہے دساتیر کے مطابق ہے لیکن کسی طرح باور کرنے کے قابل نہیں۔ ساسان پنجم خسرو پرویز، نبیرۂ شیروان کا ہم عصر ہے، دارا کو جو سکندر سے مغلوب ہوا اسی کا جد سومی لکھا ہے حالانکہ پرویز اور دارا کے درمیان 500 برس سے زیادہ کا فاصلہ ہے''۔ (ہرمزد ثم عبدالصمد، حاشیہ، احوال غالب ص 242)

غالب کے مخالفین نے اس معاملے میں صرف دو باتوں پر غور کیا ہے۔

(1) ہرمزد یا عبدالصمد سے جو باتیں غالب نے منسوب کی ہیں وہ قابل قبول نہیں ہیں اور (2) چودہ (14) برس کی عمر میں غالب نے اس استاد سے بھلا کیا استفادہ کیا ہوگا۔

قاضی عبدالودود صاحب نے حالی کے خیال پر مناسب تنقید کی ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ ''غالب نے یہ بات کہی ضرور تھی کہ عبدالصمد وجود خارجی نہیں رکھتا تھا ورنہ حالی اس کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ قاضی صاحب نے حکیم غلام رضا خان دہلوی کے ان الفاظ کا حوالہ دے کر اپنی تحقیق کو اور اہم بنا دیا ہے کہ ''صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا نہ اردو۔ یہ جو مرزا صاحب عبدالصمد کو اپنا استاد لکھتے ہیں اس شخص کا وجود ذہن میں تھا خارج میں نہ تھا۔''

(شہباز کے استفسار کے جواب میں: ہرمزد ثم عبدالصمد احوال غالب ص 351)

قاضی صاحب نے اس خیال کو بھی رد کر دیا ہے کہ ملا عبدالصمد نے کسی دوسرے ملک سے غالب کو خط لکھا تھا۔ (احوال غالب، ص 250)

ڈاکٹر سید عبداللہ کہ جنہوں نے ''یادگار غالب'' کو غالب کی پرانی اور نئی سوانح عمریوں میں سب سے نمایاں جگہ دی، اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

''حالی نے غالب کا نفسیاتی تجزیہ نہیں کیا اور ظاہر ہے کہ اپنے دور کے مذاق کے مطابق وہ کر بھی نہیں سکتے تھے، ممکن ہے کہ یہ عیب ہو لیکن میری نظر میں اس عیب سے بڑا (بشرطیکہ عیب ہو)، یہ عیب ''یادگار غالب'' میں پایا جاتا ہے کہ حالی نے بعض واقعات کو حل ناشد چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً ملا عبدالصمد کی شاگردی کا مسئلہ، پنشن کا تصفیہ، قدردانی اور

بے قدری کا قصہ، ان معاملات میں حالی سے اس سے بہتر تحقیق کی توقع تھی مگر ان سے ہو نہیں سکی۔" (غالب کی سوانح عمریاں۔ ماہ نو، کراچی، جون 1964)

ہرمزد (عبدالصمد) غالب کی سائیکی کا ایک آتشیں پیکر تھا جس کی ایک خارجی صورت اس طرح نمایاں ہوئی تھی۔ آتش اور بلندی یا رفعت کے آرچ ٹائپ (Archetype) نے اس کی تخلیق کی تھی، ہرمزد غالب کے ہمہ گیر لاشعور اور ان کے جذبہ واحساس کی تصویر تھا۔ ان کی شخصیت کا ایک آئینہ۔ نرگسی مزاج اور مجرد جمالیاتی رجحان نے اس پیکر کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ فن کار بعض حالات میں جب زیادہ دباؤ محسوس کرتا ہے یا احساس کمتری کا شکار ہونے لگتا ہے تو وہ اکثر "بلندی" یا "رفعت" کے آرچ ٹائپ کو لاشعوری طور پر شدت سے ابھارتا ہے۔ غالب کے بنیادی آرچ ٹائپ، 'آتش' نے اس صورت کی تخلیق میں زیادہ مدد کی ہے۔

ہرمزد، زرتشتی، ایران، آتش پرستی، تیمسار، اروند بندہ، پارسی نژاد، پارسیوں کے مذہبی خیالات اور اسرار، پارسی اور سنسکرت ان تمام لفظوں کے پیچھے نسلی شعور ان بنیادی آرچ ٹائپ، 'آتش' اور نور کا عمل محسوس ہوتا ہے۔

ملا عبدالصمد، اسلام، علمائے عرب و بغداد سے تعلیم و تربیت یا علوم عربیہ، یہ وہ لباس ہے جسے غالب نے شعوری طور پر اس پیکر کو پہنایا ہے، اس کی اہمیت اور معنویت کو سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ غالب تو سچے کفر کی اسی پیغمبرانہ شان سے پہچانے جاتے ہیں۔ آریائی مزاج (ایرانی۔ ہندی) عربی عقائد اور ہندوستانی تہذیب و تربیت سے اس حسیاتی پیکر کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ غالب کے خود اپنے اس پیکر کی ایک جھلک ہے۔ جس کی مکمل تصویر ان کے لاشعور میں مجرد صورت میں ہوگی۔ اس پیکر کی تشکیل میں جن حالات کو دخل

ہے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ ان ہی حالات نے لاشعور کو متحرک کیا ہے اور یہ تصویر اجاگر ہوئی ہے۔

ضعیف ایک ترک جسے اپنی نسلی برتری کا شدید نفسیاتی احساس تھا، اعتراضات کی بوچھار سے پریشان ہو جاتا ہے اور اپنی وضع داری، حسن پسندی، انائیت، نرگسی رجحان اور اپنی شخصیت اور سائیکی کو سنبھالے چودہ برس کا نوجوان بن جاتا ہے۔ اپنے وژن میں آگرہ پہنچ جاتا ہے۔ ایک صبح دروازہ کھولتا ہے تو اس کے سامنے ایک آتشیں پیکر نظر آتا ہے جو ہرمزد بن جاتا ہے۔ وہ آتش کے اس پیکر کو اپنے وجود کی گہرائیوں میں لے جاتا ہے، اسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اس لیے کہ یہ خود اس کے اپنے وجود کا حصہ ہے، اس نے خود اسے باطن سے نکال کر خارج میں رکھا تھا اور اسے سیاح بنایا تھا، ملا عبدالصمد کا لباس پہنا کر اسے صرف 'دو برس' ساتھ رکھتا ہے۔ باطن میں یہ آتشیں پیکر جذب ہو جاتا ہے اور شخصیت کی تکمیل کا احساس ہو جاتا ہے تو خارجی وجود پگھل جاتا ہے، کہتا ہے دو سال بعد اسے رخصت کر دیا:

'وژن' کی اس حسیاتی تصویر اور پورے عمل سے ایک بار پھر ضعیف ایک ترک کی انانیت، رفعت اور بلندی اور آریائی آتشیں لہروں کے ساتھ لہرانے لگتی ہے۔ نسلی برتری کا احساس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ ہندی نژاد فرہنگ لکھنے والوں سے خود کو زیادہ بلند پاتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اسے ہندوستان کا تنہا فارسی داں سمجھا جائے۔ کہتا ہے ''فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ عشق کمالی میں نے استاد سے حاصل کیا''۔ (نامہ غالب، ص 185) اور ''فارسی کی جو فرہنگیں حضرات نے لکھی ہیں مطلب مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کس استاد سے حاصل کیا۔'' (نامۂ غالب، ص 185)

اس غسل آتشیں کے ساتھ ہی وہ بڑے مدلل اور منطقی انداز میں ادبی مباحث کی اہمیت واضح کرتا ہے۔ فرہنگ نگاروں کے متعلق اصولی باتیں کرتا ہے۔ ایک تخلیقی فنکار کی آواز گونجتی ہے۔ علمی، ادبی اور لسانی مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے اس عمر میں اپنی پہلودار شخصیت اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے جانے کتنے پردے اٹھا دیتا ہے۔ اس کی آواز کہیں بہت گمبھیر ہو جاتی ہے اور کہیں بہت تیز لہجے میں عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ تلخیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس آتشیں حسّی پیکر کو جذب کرتے ہی وضع دار، حسن پسند اور صاحب ذوق شاعر کے علم اور اس کی شخصیت کے بہت سے گوشے اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اس کی گفتگو میں بعض کمزوریاں ضرور ہیں لیکن قدم قدم پر ایک شفیق، شائستہ، ذہین، سنجیدہ، جذباتی لیکن صاحب منطق تخلیقی فنکار معلم کی پہچان ہوتی ہے۔

اس نفسیاتی گریز اور التباس، اس وجدان اور وژن، اس نرگسی عمل اور ردعمل اور ان باطنی آتشیں اور نوری لہروں اور پوری سائیکی کے بہاؤ میں غالب کے ساتھ اور کون شریک ہے جو ہرمزد یا عبدالصمد سے ذاتی واقفیت کا مدعی ہے؟ باطن کے اس سفر میں غالب نے شاید ہی کبھی یہ سوچا ہو کہ 1226ھ میں آگرے میں ان کے علاوہ اور بھی لوگ تھے 'ان کے ہم عمر' ان کے بزرگ ۔حیاتی کیفیتوں میں کسی قسم کی 'تردید' کا بھی انھیں خوف نہ تھا۔

دراصل ہرمزد۔عبدالصمد کے پیکر کی تشکیل ''علم کی روشنی'' کی نئی دریافت تھی۔ ہرمزد کو مختلف علوم اور تخیل وافکار کی لہروں کی بازیافت کی علامت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ 'آئین معنی آفرینی' سیکھنے کے لیے غالب نے اپنی سائیکی کے آئینہ آتشیں سے گفتگو کی تھی۔

یہ بظاہر حیرت کی بات ہے کہ غالب بیدل سے متاثر ہوئے اور اس کا اعتراف

بھی کیا۔ جلال، اسیر، شوکت اور ناسخ وغیرہ کے طرز بیان سے متاثر ہوئے اور ان کے اثرات کی پہچان ابتدائی شاعری میں ہر جگہ ہوتی ہے، ظہوری اور عرفی کے کلام سے روشنی حاصل کی اور فارسی غزلوں میں ان شعراء کا نام فخر سے لیا لیکن عبدالصمد کے اثرات کی نہ کہیں پہچان ہوتی ہے اور نہ اس طرح کہیں ذکر ملتا ہے۔ غالب نے ''قاطع برہان'' سے قبل اس پیکر کا کہیں کوئی ذکر کیوں نہیں کیا؟

یہ حیرت کی بات بھی نہیں ہے اس لئے کہ غالب نے اس پیکر کو اپنی ذات سے الگ کر کے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ وہ غالب کہ جنہوں نے کلکتے میں قتیل کو فرید آباد کا کھتری بچہ کہا تھا اور انھیں سند ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا اور پھر ایک بڑے ہنگامے کی ابتداء ہو گئی تھی اور گلی کوچوں میں ہنگامہ ہو گیا تھا۔ سند کے طور پر بھی اپنے استاد کا ذکر نہیں کرتے۔ نواب علی اکبر خاں طباطبائی، مولوی محمد محسن، مرزا کارواں درانی، مولوی عبدالکریم اور غالب کے مخالفین کی نوک جھونک میں بھی انہوں نے کبھی اپنے دوستوں سے یہ نہیں کہا کہ ملا عبدالصمد کی سند پیش کر دیا مستند شعراء کی فہرست میں ان کا بھی نام شریک کرو، قتیل کے مداحوں کو اس پیکر سے مرعوب کیا جا سکتا تھا جبکہ وہ غالب کا استاد اور فارسی اور عربی کا اتنا زبردست عالم تھا۔ ''مثنوی آشتی نامہ'' (بادِ مخالف) میں بھی غالب نے ہرمزد عبدالصمد کا ذکر نہیں کیا ہے۔ فیض ہرمزد یا افکار عبدالصمد کے ذکر کی ہر جگہ گنجائش موجود تھی۔ اسی طرح کلیاتِ فارسی میں بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا، قاطع برہان سے پہلے انہوں نے ہرمزد کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ یہی کہتے رہے کہ میرا کوئی استاد نہیں ہے۔

میرے نزدیک کوئی بات حیرت انگیز نہیں ہے۔ ان حالات میں انھیں خود پر اتنا بھروسہ تھا کہ ''تقسیم ذات'' کا کبھی خیال ہی نہ آیا۔ اپنی شخصیت کو ایک وحدت کی صورت

میں ہمیشہ دیکھتے رہے۔ جب انانیت کے مجروح ہونے کا خدشہ بڑھا اور یہ محسوس ہوا کہ ان کی جذباتی اور داخلی قدریں مجروح ہورہی ہیں تو انہوں نے آتش اور رفعت اور بلندی کے آرچ ٹائپ کے دباؤ سے اپنے باطن سے اس پیکر کو نکالا اسے ہلکے طور پر متعارف کیا۔ پڑھے لکھے طبقے اور مخالفین کو مرعوب کرنا چاہا اور اس طلسم کی جھلک دکھا کر اس صدی کے اس بڑے جادوگر نے اسے چھپا لیا، شخصیت پھر ایک وحدت ہوگئی۔ اور انہوں نے کہا ''عبدالصمد محض ایک فرضی نام تھا!''

غالب کی راست گوئی پر کسی کو بھلا کیا شک وشبہ ہوسکتا ہے، یہ جھوٹ نہیں تھا۔

اس 'شعوری عمل' کے پیچھے ایک فعال اور تہہ دار سائیکی کو کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے جس میں ''دانشمند ضعیف آدمی''(Wise Old Man) کا حسی آرچ ٹائپ موجود تھا!

غالب نے اس پیکر سے اپنی شخصیت کی تکمیل اس طرح کی ہے کہ اسے علوم عربیہ اور منطق اور فلسفہ کا عالم بنادیا ہے۔ غالب کو اپنی کمزوری کا احساس تھا۔ اپنی ذات میں ان علوم کی روشنی دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ پیکر ان کے مزاج کا آئینہ اس طرح بن جاتا ہے کہ دہلی کا وضع دار، رئیس زادہ اسے کمتر حیثیت میں دیکھ نہیں سکتا تھا لہٰذا اسے یزد کا امیر زادہ بنایا اور اس کا سلسلہ نسب ساسان پنجم تک دیکھا اور یہ کہا کہ وہ جلیل القدر امیر زادوں میں شمار ہوتا تھا۔ نسلی برتری کے احساس نے اس پیکر کو دارابی بنایا اور اسے تصوف کی رومانیت کا سرچشمہ قرار دیا۔ دراصل غالب خود اپنی ذات کو اس آئینے میں دیکھنا اور شعوری طور پر دکھانا چاہتے تھے۔ ایسے رجحان کو ''شعوری''، منطقی اور مادی فینتاسی (Phantasy) کہتے ہیں۔ خارجی قدروں کے مطابق خیال، احساس اور داخلی دباؤ اور باطنی عمل سے ایسی

فینٹاسی پیدا ہوتی ہے اور لمحاتی رجحان پیدا ہوتا ہے۔ خارجی حقیقتوں اور داخلی نفسیاتی کیفیتوں کے درمیان جو ''خارجی تجربہ'' بعض لمحوں میں منجمد کیا جاتا ہے اسے شعوری اور منطقی فینٹاسی کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید علمائے نفسیات اس کو فرد کا ایسا آزاد، منطقی اور استدلالی عمل کہتے ہیں جس کا باطنی رشتہ نسلی شعور اور انسان کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر اس عمل کی سچائی اور حقیقت کے پیش نظر دیکھا جائے تو مجموعی طور پر اس کی ''خارجی اہمیت'' سے انکار بھی کیا جاسکتا ہے اور یہ بات بھی منطقی ہوگی۔

****

غالب اکیڈمی

پروفیسر الطاف احمد اعظمی

ڈپٹی نذیر احمد کی نثر نگاری

(ان کے ناولوں کے حوالے سے)

اہل علم وادب بخوبی جانتے ہیں کہ اٹھارویں صدی سے پہلے اردو نثر نے جو ترقی کی وہ مختلف داستانوں کے تراجم تک محدود تھی۔ مثلاً مشہور شاعر وجہی کی ''سب رس'' جو 1635ء میں دکن کی سرزمین میں لکھی گئی۔ یہ ایک فارسی کتاب ''قصہ حسن ودل'' سے ماخوذ اور تمثیلی اسلوب میں ہے۔[1] فضل علی فضل کی ''کربل کتھا'' بھی قابلِ ذکر ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی (م 1504) کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہداء''[2] کا ترجمہ ہے۔ اس زمرے میں سودا کا دیباچہ بھی شامل ہے جو اس نے اپنے مجموعۂ مراثی پر لکھا ہے۔ اردو نثر کے ان ابتدائی نمونوں میں زبان پیچیدہ اور مقفّیٰ ہے اور فارسی الفاظ وتراکیب کی کثرت کی وجہ سے ان پر فارسی نثر کا گمان ہوتا ہے، صرف افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو نثر ہے۔

اٹھارویں صدی تک اردو نثر کا یہی رنگ وروپ رہا۔ اس صدی کے آخر میں لکھی گئی کتاب ''نوطرزِ مرصع'' پر بھی سترھویں صدی کا رنگ تحریر غالب ہے۔ عربی اور فارسی

الفاظ کی بہتات نے اسے عسیر الفہم بنادیا ہے۔ یہ میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی تالیف ہے جو دراصل فارسی داستان ''قصۂ چہار درویش'' کا ترجمہ ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی اردو نثر کے اسلوب نگارش میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس سلسلے میں فورٹ ولیم کالج جو 1800ء میں قائم ہوا، کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' گو کہ تحسین کی کتاب ''نوطرز مرصع'' کا عکس ثانی ہے لیکن اس کی زبان نہایت سہل و سادہ اور بول چال کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اردو میں سادہ نثر نگاری کی یہ اولین کوشش تھی اور اس طرز تحریر کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بعد کے نثر نگاروں نے اس سادہ طرز تحریر کو فروتر خیال کر کے دوبارہ زبان کو عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کی ارادی آمیزش سے ثقیل بنا دیا جس کا ایک نمونہ مرزا رجب علی بیگ سرور (م 1869) کی معروف کتاب ''فسانۂ عجائب'' ہے۔ اس میں تصنع، لفظی صناعی اور عبارت آرائی زیادہ ہے۔ ایک عرصہ تک یہی اسلوب نگارش پسندیدہ اور مقبول رہا اور اس کی وجہ اس عہد کا معاشرہ تھا جس میں تصنع اور نمود و نمایش کو غلبہ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ فارسی نثر کی طرف غیر معمولی میلان بھی اس کا ذمہ دار ہے۔

حقیقی معنی میں جدید نثر نگاری کا آغاز مرزا غالب (م 1869) کے اردو مکاتیب سے ہوا۔ ان کے عہد میں اردو کی ادبی اور علمی نثر کا جو رنگ و آہنگ تھا اس میں لفاظی اور عبارت آرائی پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ غالب نے اس مصنوعی طرز تحریر کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی خداداد ذہانت سے مکتوب نگاری کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا جس میں سادگی و شوخی اور طرفگی کے ساتھ حد درجہ بے تکلفی ہے۔ انھوں نے مراسلت کو جیسا کہ

خود لکھا ہے مکالمہ بنا دیا۔ یہ دراصل ایک تخلیقی نثر ہے جس کے آئینے میں اس عہد کی علمی و تہذیبی اور سیاسی زندگی کے خد و خال بالکل نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ غالب نے جو تقریظیں اور مختصر رسائل لکھے ان میں قدیم رنگ تحریر حاوی ہے یعنی تکلف اور عبارت آرائی جیسا کہ ان کے فارسی خطوط میں ہے۔ غالب کے اردو مکاتیب کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم لیکن اس طرز تحریر کو ابھی مزید مشاطگی کی ضرورت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کو سادہ علمی نثر بنانے اور اس کے منطقی استدلال کا رنگ دینے میں سر سید اور ان کے رفقا نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ سر سید کے عہد میں اردو ادب کا جو حال زبوں تھا اس کو انھیں کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

> ''علم ادب وانشا کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن کلموں کے تک ملانے اور دور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب و ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔''[۳]

سر سید نے اردو نثر کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے خود اپنے طرز تحریر کو بدلا اور متعدد کتابیں اور رسائل لکھ کر ایک نئے طرز اظہار کو رواج دینے کی کوشش کی۔ اس طرز تحریر میں بڑی وضاحت اور صراحت ہے، تصنع، مبالغہ آرائی، لفظی اسراف اور عبارت آرائی کی جگہ سادگی، بے تکلفی، سچائی اور حقیقت نگاری کی خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ ایک علمی اور استدلالی نثر ہے۔ نثر نگاری کے اس طرز ادا کو بہت جلد مقبولیت حاصل ہوئی اور نثر نگاروں کی ایک ایسی جماعت وجود میں آگئی جس میں ڈپٹی نذیر احمد بھی شامل تھے۔

نذیر احمد اس اعتبار سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے کہ وہ ایک بڑے عالم تھے

اور دلی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے جدید علوم اور انگریزی زبان سے بھی بقدر ضرورت آگاہ تھے۔ مشرقی اور مغربی علوم کے امتزاج نے ان کے فکر ونظر کے کینوس کو کافی وسیع کر دیا تھا۔ انھوں نے کئی مذہبی کتابیں لکھیں، قرآن مجید کا ترجمہ کیا، خطوط لکھے، تقریریں کیں اور ناول تحریر کیے۔ یہ سب چیزیں چھپ چکی ہیں۔ ہم یہاں صرف ان کے ناولوں کے حوالے سے ان کی نثر نگاری کا جائزہ لیں گے۔

یہ بات بڑی اہم ہے کہ عالم دین ہونے کے باوجود ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ہم عصروں کے برخلاف اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ایک ایسی صنف کا انتخاب کیا جو ہنوز غیر متعارف تھی۔ میری مراد ناول سے ہے۔ اس انتخاب کی وجہ تمثیلی اسلوب کی خوبی ہے۔ اس خیال کی تائید ان کے ناول ''مرأۃ العروس'' کے دیباچے سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''نرے مذہبی خیالات بچوں کے مناسب حالت نہیں اور جو مضامین ان کے پیش نظر رہتے ہیں ان سے ان کے دل کی افسردگی، ان کی طبیعتوں کا انقباض اور ان کے ذہنوں کو کندی ہوتی ہے۔ تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق ونصائح سے بھری ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کو زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کج رائی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج ومصیبت رہا کرتی ہیں۔ ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کی تہذیب کرے اور کسی دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا دل نہ اکتائے، طبیعت نہ گھبرائے مگر تمام کتب خانہ چھان مارا ایسی کتاب کا پتہ نہ ملا تب میں نے اس قصے کا منصوبہ باندھا۔''4

اس اقتباس سے بالکل ظاہر ہے کہ نذیر احمد نے ناول نگاری کی طرف کیوں توجہ کی۔ ناول نگاری سے ان کا مقصد دراصل اصلاحِ معاشرہ تھا۔ ''توبۃ النصوح'' کے دیباچے

میں جوان کا ایک مقبول ناول ہے، لکھتے ہیں:

> ''لوگوں کے ذہن نشین کر دیا جائے کہ تربیت اولاد صرف اسی کا نام نہیں کہ پال پوس کر اولاد کو بڑا کر دیا، روٹی کمانے کھانے کا کوئی ہنر ان کو سکھا دیا۔ ان کا بیاہ برات کر دیا۔ بلکہ ان کے اخلاق کی تہذیب، ان کے مزاج کی اصلاح، ان کی عادات کی درستی، ان کے خیالات اور معتقدات کی تصحیح بھی ماں باپ پر فرض ہے۔''5

اسی اصلاحی جذبے سے جس کا ذکر اوپر کے اقتباس میں ہوا، نذیر احمد نے متعدد ناول لکھے۔ مراۃ العروس ان کا پہلا ناول ہے جو 1869ء میں لکھا گیا۔ اس کا مقصد امور خانہ داری سے واقفیت ہے کہ کس طرح ایک لڑکی علم و ہنر سے آراستہ ہو کر ایک خاندان کی اصلاح کا کام انجام دیتی ہے۔ اصغری اور اکبری اس کے دو اہم کردار ہیں لیکن پہلا کردار زیادہ وقیع اور طرح دار ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''بنات النعش'' ہے جو 1873ء میں شائع ہوا۔ اس کا موضوع معلومات ضروری ہے یعنی لڑکیوں کو دست کاری کی تعلیم ضروری ہے۔ تیسرا ناول ''توبتہ النصوح'' ہے جو 1877ء میں لکھا گیا اور یہ نذیر احمد کا سب سے اہم ناول ہے جس میں اولاد کی جسمانی پرورش کے ساتھ ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت پر زور دیا گیا ہے۔ کلیم اور مرزا ظاہر دار بیگ اس کے موثر کردار ہیں۔

نذیر احمد کا چوتھا ناول ''محصنات معروف بہ فسانہ مبتلا'' ہے (1877ء) اس میں دو شادی کی خرابی کا ذکر ہے۔ مبتلا اور ہریالی اس کے بنیادی کردار ہیں۔ پانچواں ناول ''ابن الوقت'' (1888ء) ہے۔ یہ ناول اپنے موضوع اور طرز بیان دونوں کے لحاظ سے بقیہ ناولوں سے جن کا اوپر ذکر ہوا، مختلف ہے۔ پہلا ناول ہے جس کا موضوع اس عہد کے

سماجی وتہذیبی اور سیاسی مسائل ہیں۔

اس ناول کے دو مرکزی کردار ہیں ایک ابن الوقت اور دوسرا حجتہ الاسلام۔ ابن الوقت مغربی تہذیب کا دلدادہ، انگریزی وضع پر فریفتہ، رواجی مذہب سے برگزشتہ، مذہبی اصول وعقائد کی تفہیم میں عقل کی برتری کا قائل، تقدیر کا شاکی اور تدبیر کا ہم نوا ہے۔ اس کے برخلاف حجتہ الاسلام ہے جو مغربی علوم کی اہمیت کا قائل مگر انگریزی وضع کا شدید مخالف اور مشرقی اقدار کا علم بردار ہے۔ وہ نمود ونمائش کی زندگی سے متنفر اور سادگی اور قناعت کا حامی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ حاکم سے خوشگوار تعلقات کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ان کی معاشرت کو اختیار نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کے لباس وطعام اور طرز بود وباش سے مذہبی زندگی متاثر ہوتی ہے اور اس میں آخرت کا نقصان ہے۔ عقل اور تدبیر کے معاملے میں وہ میانہ روی کا قائل ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ عقل محدود ہے اس لیے امور میں ایک حد سے زیادہ اس پر تکیہ کرنا غلط اور اس معاملے میں بابِ تاویل کھولنا گمرہی کا موجب ہے۔ مذہبی زندگی میں عقل کے ساتھ وحی کی رہ نمائی کے بغیر چارہ نہیں کہ عالم غیر مادی کے احوال وحقائق کی تفہیم عقل کے دائرہ ادراک سے خارج ہے۔

ابن الوقت کے مقابلے میں حجتہ الاسلام کا کردار زیادہ حقیقی نہیں ہے حالانکہ نذیر احمد نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس کردار کو زیادہ نمایاں اور موثر بنا کر پیش کریں۔ اس کوشش میں انھوں نے ابن الوقت کے ساتھ کئی مقامات پر انصاف نہیں کیا ہے۔ یہاں ملحوظ رہے کہ حجتہ الاسلام دراصل نذیر احمد اور ابن الوقت سر سید ہیں۔ پورا ناول سر سید ہی کے افکار وخیالات اور ان کی اصلاحی تحریک کے گرد گھومتا ہے۔ ان میں مذہبی نقطہ نظر پوری

طرح غالب ہے لیکن اس کے باوجود فکری اور فنی اعتبار سے یہ ایک کامیاب ناول ہے۔ اس میں واقعات کا منطقی ربط قائم رہتا ہے۔ اس کے سارے کردار جیتے جاگتے ہیں اور ایک ایسے معاشرے کی تصویر پیش کرتے ہیں جس میں مشرقی اقدار اور مغربی تہذیب کی کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں کو ان کے زمانے میں خواص اور عوام دونوں میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ خود انھوں نے ''فسانۂ مبتلا'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''ان کتابوں نے ایسا رواج پایا کہ انگریزی، بنگالی، گجراتی، بھاکا، مرہٹی، پنجابی، کشمیری سات زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اس وقت تک چالیس ہزار جلدیں چھپ چکی ہیں۔''

اس مقبولیت کی تین بڑی وجہیں تھیں۔ ایک ان کے پلاٹ کی واقعیت، گو کہ بعض ناولوں میں منطقی ربط و تسلسل کی کمی ہے، دوسرے ان کی غیر معمولی کردار نگاری اور منظر کشی، اور تیسرے ان کی زبان کی طرفگی، طرز بیان کی ندرت و شگفتگی اور زور و قوت ہے۔

معلوم ہے کہ نذیر احمد سے پہلے اردو میں صرف داستانیں تھیں جن میں خیالی اور فوق فطری دنیا کے احوال و مقامات پیش کیے گئے ہیں ان میں فطری واقعات اور حقیقی زندگی کی تصویر نہیں ملتی۔ نذیر احمد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو کے افسانوی ادب کو حقیقی زندگی کے خدوخال سے روشناس کیا۔ ان کے پلاٹ میں تھوڑی بہت کمی ضرور ہے لیکن وہ خیالی دنیا سے نہیں لیے گئے ہیں بلکہ حقیقی اور اصلی دنیا کے جیتے جاگتے واقعات پر مبنی ہیں۔ ان میں سچائی، زندگی اور توانائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار معاشرے کے آئینے ہیں جن کی مدد سے ہم جان سکتے ہیں کہ ان کے عہد کا مسلم معاشرہ کن اچھائیوں اور کن خرابیوں

سے مرکب تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''نذیر احمد کا بڑا کام اصلاح معاشرہ (سوشل ریفارم) ہے یعنی یہ کہ دنیا میں خوش، کامیاب اور بے لوث زندگی کیوں کر بسر کرنی چاہیے۔ ایک بڑا کمال ان کی تصانیف میں یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی سوسائٹی اور خاص کر اسلامی خاندان کی تصویر ایسی سچی اور بے لاگ کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے اور ایک مسلمان پڑھنے والے کو رہ رہ کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اس کے خاندان کے پترے تو نہیں کھل رہے ہیں''[6]

آگے مزید لکھا ہے:

روزمرہ کے معمولی واقعات جو صبح و شام ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے گھروں کے اندر باہر واقع ہوتے رہتے ہیں، ان کا بیان کرنا مولانائے مرحوم پر ختم ہے اور بیان بھی کیسا! ایسا پر لطف، ایسا سچا اور سلجھا ہوا کہ دل میں کھب جائے اور پڑھنے کے ساتھ ہی آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں آجائیں۔ ایک ایسے منظر کی تصویر کھینچنا جس میں پہاڑ بھی ہوں، صحرا بھی ہو، دریا بھی ہو آسان ہے۔ لیکن انسانی خصائل یا کسی ادائے خاص کی تصویر کھینچنا بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف اوپری نظر جو بیرونی اشیا تک محدود ہو کافی نہیں بلکہ اسے عکس ریز (X-rays) کی طرح جسم کے اندر گھس کر دلوں کو بھی ٹٹولنا پڑتا ہے اور مولانا میں یہ قوت بدرجۂ کمال موجود تھی۔''[7]

اس سلسلے میں ایک مثال ''توبتہ النصوح'' سے پیش کرتا ہوں۔ ایک مسلم خاندان کے دو بگڑے ہوئے نوجوانوں کی تصویر کس خوبی سے کھینچی گئی ہے:

''ایک نابکار کو دیکھو کہ وہ ماش کے آٹے کی طرح ہر وقت اینٹھتا رہتا ہے، کبھی سینے پر نظر ہے کبھی بازوؤں پر نگاہ ہے۔ آدم زاد ہو کر لقا کبوتر کا پٹھا بنا پھرتا ہے۔ اتنا اکڑتا ہے، اتنا اکڑتا ہے کہ گردن گدی میں جا لگی ہے۔ کپڑے ایسے

چست کہ گویا بدن پر سیے گئے ہیں۔ چھاتی پر انگرکھے کے بند ہیں، گھٹنوں تک پائجامے کی چوڑیاں ہیں۔ ایک دیولی برابر ٹوپی ہے کہ خود بہ خود گری پڑتی ہے۔ دوسرا نانہجار صبح اٹھ کر کبوتر کھول باپ دادے کا نام اچھالنے کوٹھے پر چڑھا۔ پہر سوا پہر دن چڑھے تک کوٹھے پر دھما چوکڑی مچائی۔ مارے باندھے مدرسہ گیا۔ عصر کے بعد سے پھر کوٹھا ہے اور کنکوا ہے۔ شام ہوئی اور شطرنج بچھا۔ اتوار کو مدرسے سے چھٹی ملی تو بٹیریں لڑائیں۔"[8]

بہت سے اہل علم و ادب کا خیال ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں میں پلاٹ کی واقعیت اور منظر کشی کی خوبی تو ہے لیکن بڑا عیب یہ ہے کہ فن پر مقصد حاوی ہے۔ یہ اعتراض بجا ہے لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کے سامنے ناول کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ اس لیے نقش اول میں بعض کمیوں کا راہ پا جانا بالکل فطری ہے۔ ہر ناول میں کوئی نہ کوئی مقصد بہر طور ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ یہ مقصد پورے ناول میں اسی طرح سرایت کیے ہوئے ہو جیسے جسم میں رگوں کے اندر خون گردش کرتا ہے لیکن نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ چونکہ نذیر احمد عالم دین تھے اور مسلمانوں کے معاشرتی زبوں حالی سے کبیدہ خاطر تھے اس لیے قدرتی طور پر مقصد ان کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا اور جوش اصلاح میں بار بار ابھر کر سامنے آ جاتا ہے اور فن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں معاملہ اس کے برعکس ہے یعنی فن مقصد پر حاوی ہے لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود ان کی جاندار مکالمہ نگاری اور حیرت انگیز منظر کشی کی وجہ سے ان کے ناول آج بھی دامن کشِ دل ہیں۔

نذیر احمد نے اپنے ان ناولوں کے ذریعے سے اردو نثر کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ کئی پہلوؤں سے قابل تحسین ہے۔ اس کا سب سے نمایاں وصف روزمرہ کا استعمال، بے

تکلفی اور سلاست بیان ہے اور یہ خوبی تقریباً ان کے ہر ناول کا طرہ امتیاز ہے۔ مراۃ العروس کے دیباچے میں انھوں نے خود لکھا ہے کہ ''جو کچھ وقت اس کتاب کی تصنیف میں صرف ہوا اس کے علاوہ مدتوں یہ کتاب اس غرض سے پیش نظر رہی کہ بولی با محاورہ ہو اور خیالات پاکیزہ اور کسی بات میں آورد اور بناوٹ کا دخل نہ ہو۔[9]

اپنی نثر کے متعلق نذیر احمد کا یہ بیان سچائی پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ان کی زبان نہایت سلیس و برجستہ و بے تکلف ہے۔ اس میں کہیں تصنع نہیں، آورد نہیں ، بیان میں بلا کا زور اور قوت ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''مرحوم اگر مراۃ العروس کے سوا کوئی دوسری کتاب نہ لکھتے تو بھی وہ اردو کے با کمال انشا پرداز مانے جاتے اور ان کی حیات جاودانی کے لیے صرف یہی ایک کتاب کافی ہوتی۔ مولانا اپنی طرز کے آپ موجد تھے۔ اور یہ ان ہی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں بڑی بے تکلفی اور بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ زبان پر انھیں اس قدر قدرت حاصل تھی کہ شاید آج تک کسی اردو انشا پرداز کو نہیں نصیب ہوئی، اور یہی وجہ ہے کہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ ان کی طبیعت قدرتی طور پر پرزور واقع ہوئی تھی اور یہی زور ان کے تمام خیالات اور الفاظ میں ہے۔ جو قوت اور زور میں نے ان کی عبارت میں دیکھا ہے وہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ انھیں اس بات کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ہیر پھیر یا تشبیہات و استعارات سے اپنا مافی الضمیر ادا کریں۔ وہ اسی زبان میں سے جسے ہم روز مرہ بولتے اور لکھتے پڑھتے ہیں ایسے الفاظ نکال لاتے تھے کہ گویا وہ اسی خیال کے ادا کرنے کے لیے بنے ہیں۔[10]

یہاں میں ایک مثال اسی ناول سے اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے ان کی زبان

کی خوبی اور طرز ادا پر روشنی پڑتی ہے۔

''اے عورتو! کیا تمھارا جی نہیں چاہتا کہ مردوں کی نظروں میں تمھاری عزت ہو۔ تم نے اپنے ہاتھوں اپنا وقار کھویا ہے، اپنے کارن نظروں سے گری ہوئی ہو، تم کو قابلیت ہو تو مردوں کو کب تک خیال نہ ہوگا تم کو لیاقت ہو تو مردوں کو کہاں تک پاس نہ ہوگا۔ مشکل تو یہ ہے کہ تم صرف روٹی دال پکا لینے اور پھٹا پرانا سی لینے کو لیاقت سمجھتی ہو۔ پھر جیسی لیاقت ہے ویسی ہی قدر ہے...... اے عورتو! مردوں کے دل کا بہلاؤ، ان کی زندگی کو سرمایہ عیش، ان کی آنکھوں کو باغ و بہار، ان کی خوشی کو زیادہ اور ان کے غم کو غلط کرنے والیاں ہو۔ اگر تم سے مردوں کو بڑے کاموں میں مدد ملے اور تم کو بڑے کاموں کے انتظام کا سلیقہ ہو تو مرد تمھارے پاؤں دھو دھو کر پیا کریں اور تم کو اپنا سر تاج بنا کر رکھیں۔ تم سے بہتر ان کا غمگسار، تم سے بہتر ان کا صلاح کار، تم سے بہتر ان کا خیر خواہ اور کون ہو۔''[11]

''توبتہ الصنوح'' میں نذیر احمد نے زبان و بیان کی خوبی و زیبائی کا زیادہ اہتمام کیا ہے۔ روزمرہ کے علاوہ محاورے اور مترادفات بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ زور بیان بھی اپنی انتہا پر ہے غرض یہ کہ لطف زبان اور حسن بیان کے لحاظ سے یہ ناول ان کے دوسرے ناولوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ مشتے نمونہ ایک دو مثالیں دیکھیں:

''ہم نے تجھ کو دنیا میں بھیجتے وقت کیا تاکید کی تھی کہ دیکھ روح ایک جوہر لطیف ہے اور مجھ کو بہت عزیز ہے۔ ایسا نہ کرنا کہ اس کو دنیا میں جا کر بگاڑ لائے۔ جیسا اجلا، شفاف، براق، روشن یہاں سے لیے جاتا ہے۔ ایسا ہی دیکھ لوں گا۔ آج تو اے روسیاہ اس کو لایا ہے پوتھ سے برتر اور ٹھیکری سے کم تر بنا کر نجس، ناپاک، تیرہ، بے آب، بدرونق، خراب۔ ہم نے چلتے چلتے تجھ سے کہہ دیا تھا کہ تو دنیا میں دل مت لگائیو اور اس طرح رہیو جیسے سرائے میں مسافر۔ تو

وہاں گیا تو بس وہیں کا ہو رہا اور ایسی لمبی تان کر سویا کہ قبر میں آ کر جاگا۔ تھا تو مسافر اور بن بیٹھا متوطن....... مسافر کا یہی کام ہے، سیاح کا یہی شیوہ ہے۔"12ے

"بڑے میاں سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ، محلہ نالاں، ہم سایے عاجز، اس کو مار، اس کو چھیڑ۔ چاروں طرف ایک تراہ مچ رہی ہے۔ غرض اس طرح کے بے سر بچے ہیں، ناہموار، آوارہ، بے ادب، بے تمیز، بے حیا، بے غیرت، بے ہنر، بدمزاج، بد زبان، بد وضع کہ چند روز سے دیکھ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ ان کی حرکات وسکنات، نشست و برخاست کوئی بھی بھلے مانسوں کی سی نہیں۔ گالی دینے میں ان کو باک نہیں، فحش بکنے میں ان کو تامل نہیں، قسم ان کا تکیہ کلام ہے۔ نہ زبان کو روک ہے اور نہ منہ کو لگام۔"13ے

نذیر احمد کی نثر کی دلکشی میں ان کی ظرافت کا حصہ کم نہیں ہے حس مزاح ان کی طبیعت میں اس درجہ دخیل تھی کہ بعض دفع خالص مذہبی تحریروں میں بھی وہ اس سے احتراز نہیں کر پاتے تھے۔ ان کی کتاب "امہات الامہ" پر مذہبی طبقے کی طرف سے جو شورو غوغا برپا ہوا اس کی وجہ ان کی ظرافت کی نشتر زنی تھی۔ مرزا فراحت اللہ بیگ نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مولوی صاحب نے ایک کتاب "امہات الامہ" لکھی ہے جس پر مذہبی لوگوں کی طرف سے کافی لے دے ہوئی۔ مولوی صاحب کو حیرت تھی کہ لوگ اس تحریر پر اس قدر برانگیختہ کیوں ہیں۔ جب انھوں نے اس کا تذکرہ مجھ سے کیا تو میں نے کہا: مولوی صاحب، آپ کا طرز تحریر مذاق کا پہلو لیے ہوتا ہے وہ کچھ قصہ کہانیوں ہی میں مزہ دیتا ہے۔۔ تاریخ کی کتابوں میں اور خاص کر

مذہبی معاملات میں وہ کسی طرح کھپ نہیں سکتا۔ اگر لوگوں کو اعتراض ہوگا تو
آپ کے طرز تحریر ہی کے متعلق ہوگا۔ 14

یوں تو ظرافت کی چاشنی تقریباً ان کے ہر ناول میں ملتی ہے اور لطف بیان کو دو چند کرتی ہے لیکن ''ابن الوقت'' میں اس کی نیرنگیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس ظرافت میں گہرا طنز پوشیدہ ہے۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ کہہ کر حجتہ الاسلام نے اذان کہی۔ اذان کی آواز سے کسی کے کان آشنہ نہ تھے۔ اصطبل میں گھوڑوں نے کنوتیاں کھڑی کیں اور کتے لگے رونے اور بھونکنے۔ بارے کسی طرح حجتہ الاسلام نے اپنے دونوں نوکروں کے ساتھ جماعت کی نماز پڑھی...... عصر کے وقت تو کتے صرف اذان پر خوب روئے تھے اب (مغرب میں) اذان کے علاوہ نماز بھی جہری تھی اور مغرب سے ذرا پہلے دستور کے مطابق کھول بھی دیے گئے تھے۔ بہتیرا خانساماں، بھنگی اور دوسرے لوگ ڈانٹتے اور دھمکاتے تھے مگر کتے سرکار کے منہ لگے ہوئے تھے، ایک نہ مانی اور سب کے سب نرغہ کر کے چڑھ آئے...... بارے اتنے میں ابن الوقت آپہنچا، گھوڑے کی آہٹ پا کر کتے اس کی طرف لپکے اور حجتہ الاسلام نے کڑک کر اپنی اذان اور نماز تمام کی۔'' 15

نذیر احمد کے لسانی امتیازات میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ان کو عورتوں کی زبان اور ان محاوروں پر قدرت حاصل تھی اور ان کے احساسات اور جذبات کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کے لب و لہجے میں ان کا اظہار کرتے تھے۔ یہ خوبی اردو کے کم ناول نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ اس سلسلے میں ''توبتہ النصوح'' کا ایک مکالمہ ملاحظہ ہو:

''عورت: جلدی سے چوکی کو اپنے دوپٹے سے جھاڑ مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میاں سے بولی ''نوج تم جیسا کوئی بے خبر ہو، کھڑے کیا ہو، جاؤ ایک گلوری

بازار سے میاں کے لیے بنوالاؤ۔"

میں: نہیں، میں پان نہیں کھاتا، تکلیف مت کرو۔"

عورت: بیٹا تمھاری خدمت میں اور ہم کو تکلیف؟ جی چاہتا ہے کہ آنکھیں تمھارے تلووں میں بچھاؤں۔ قربان اس پیاری پیاری صورت کے، نثار اس بھولی بھالی شکل کے، بیٹا یہ تو بتاؤ کہ ہو کون؟"[16]

ایک مثال "ابن الوقت" سے بھی پیش ہے:

"اے ہے، غدر کے دنوں میں کچھ ایسی گھڑی اس موے فرنگی کا پیر گھر میں آیا تھا کہ بچے کی مت پھیر دی۔ ہم سے تو ایسا چھپایا، ایسا چھپایا کہ دن کو گورے شہر میں گھسے اور رات کو ہم نے جانا کہ سارے غدر ہمارے گھر میں فرنگی چھپا رہا۔ جس وقت فرنگی کو لائے تھے۔ اگر ذرا بھی کسی کو معلوم ہوتو میں اس کو کھڑا پانی نہ پینے دوں۔ خدا جانے کمبخت کہاں سے ہمارے گھر آمرا تھا۔ نہ آتا نہ بچہ ہاتھ سے جاتا۔ آخر میرا صبر پڑا پھر پڑا۔ کسی کی آہ لینا اچھا نہیں ہوتا پیچھے ایسا راگ لگایا کہ سارے دن اٹوائی کھٹوائی لیے پڑا رہتا تھا۔ آخر کو جاتے ہی بن پڑی کالا منہ۔ خدا کرے پھر آنا نصیب نہ ہو۔"[17]

نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں کہیں کہیں انشا پردازی کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ "توبتہ النصوح" اور "ابن الوقت" میں حسن انشا کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ خود توبتہ النصوح کا دیباچہ انشا پردازی کا شاہکار ہے۔ اس کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

"ساری زندگی میں بیس پچیس برس کام کاج کے دن ہیں مگر کتنے کام، کتنی ضرورتیں، کس قدر بکھیڑے، کتنے مخمصے، خدا کی پرستش، مذہب کی تلاش، کسب مال، فکر معاش، بزرگوں کی خدمت، اولاد کی تربیت، بیماروں کی عیادت، احباب کی زیارت، تقریبات کی شرکت، شہروں کی سیر، ملکوں کی سیاحت،

مردوں کا رونا، جدائی کا ماتم، مولود کی خوشی، ملاقات کی فرحت، دفع مضرت، جلبِ منفعت، گزشتہ کا احتساب، آئندہ کا انتظام، مسرتِ بے ہودہ، ہوسِ نام و نمود، تاسف نقصان، حسرت زیاں، تلافی مافات، پیش بنی، دوستوں سے ارتباط، دشمنوں سے احتیاط، آبرو کا تحفظ، ناموس کا پاس، مال کی نگہداشت، محاصل کا احراز۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

اس ضیق فرصت پر کاموں کا اتنا ہجوم یعنی فراخِ دل مفقود وہ اطمینانِ خاطر معدوم۔

فکر معاش ذکر خدا یاد رفتگاں
دو دن کی زندگی میں بھلا کوئی کیا کرے

ایک عقل اور دنیا بھر کی ذمہ داری سچ کہا ہے 'یک عشق و ہزار گونہ خواری'18۔

حسن انشا پردازی کی ایک دو مثالیں ''ابن الوقت'' سے بھی پیش کرتا ہوں:

''یہ دنیا تو پھر عالم شہود ہے کہ ہم اس میں موجود ہیں اور اسے دیکھتے اور تھوڑا یا بہت اس میں تصرف بھی کر سکتے اور کرتے ہیں۔ دین خبر دیتا ہے کہ اس دنیا کے سوا ایک جہاں اور بھی ہے۔ یہ ظاہر ہے وہ غائب، یہ فانی ہے وہ باقی، یہ مجاز ہے وہ حقیقت، یہ تمہید ہے وہ نفس مطلب۔ یہ امتحان ہے وہ نتیجہ، یہ سفر ہے وہ منزل مقصود، یہ خواب ہے وہ تعبیر، یہ افسانہ ہے وہ حق۔19

''دین جس کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کے تعلقات سب ہیچ ہیں، دنیاوی خوشیوں کو منغض نہیں بلکہ دنیاوی رنج اور خوشی دونوں کو انسان کی نظر

میں حقیر اور ناچیز کر دیتا ہے۔ جو شخص غصے کو پی جائے، انتقام نہ لے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے، حریص وطماع نہ ہو، جابر و سخت گیر نہ ہو، ممسک وبخیل نہ ہو، مغرور ومتکبر نہ ہو، کسی سے لڑے نہ جھگڑے،، نہ کسی کا حسد کرے۔ نہ کسی کو دیکھ کر جلے، عافیت میں شاکر، مصیبت میں صابر، حسن خلق، بردبار، متحمل، متواضع، منکسر، مستغنی، نفس پر ضابط، قانع، سیر چشم، متوکل، ثواب عافیت کا امیدوار یعنی خلاصہ یہ ہے کہ دیندار ہو،" 20

نذیر احمد عربی زبان وادب کے ایک بڑے عالم تھے اس لیے قدرتی طور پر ان کے اکثر ناولوں میں عربی و فارسی کے سبک وشیریں الفاظ وتراکیب بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں لیکن جا بجا ثقیل الفاظ وتراکیب، ضرب الامثال اور قرآنی آیات کا بھی استعمال ہوا ہے جس کی وجہ سے عبارت کی روانی میں خلل پڑا ہے۔ "توبتہ النصوح" میں اس کی مثالیں زیادہ ہیں۔ مثلاً اشتداد (ص 32)، متکفل (33)، حیز التواء (42)، تحریری تمسک (ص 23)، ذات مستجمع الصفات (ص43)، احتیاط کما ینبغی، حفاظت کما حقه (ص 53)، استشارہ، حکم المستشار موتمن اصلاح (ص246)، کنز المکنون (ص256)، ومامن دابته فی الارض الاعلی الله رزقها (آیت، ص43)، صبغته الله ومن احسن من الله صبغته (آیت، ص285)، والکاظمین الغیض والعافین عن الناس (آیت، ص235) وغیرہ۔

"ابن الوقت" میں بھی عربی کے ثقیل الفاظ استعمال ہوئے ہیں لیکن "توبتہ

النصوح'' سے نسبتاً کم مثلاً استمالتِ قلوب خلائق (ص50)، تفضیح (ص88)، استکراہ (90)، تعذر (ص92)، الغریق بتشبت بالحشیش (عربی ضرب المثل یعنی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا) کما ہو حق الذعانہ (ص214) وغیرہ۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی نثر کے عیب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ان کی عبارت کی روانی اور بے ساختگی کا جواب دوسری جگہ ملنا مشکل ہے مگر چلتے چلتے راستے میں عربی روڑے ہی نہیں بچھاتے بلکہ پہاڑ رکھ دیتے ہیں۔ غرض یہ تھی کہ لوگ جان لیں کہ میں دہلی والا ہی نہیں ہوں، مولوی بھی ہوں۔''21

انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندی کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں اور یہ زیادہ تر سبک اور عام فہم ہیں۔ مثلاً کھنڈت (ابن الوقت، ص172) آتما (ص18)، پراچین، دھرم (ص179) لوبھ (211)، سمے اور کارن وغیرہ۔ ہندی کے یہ الفاظ ان مقامات پر استعمال ہوئے ہیں جہاں کوئی ہندو کردار برسرِ مکالمہ ہے۔

نذیر احمد کو محاوروں کے استعمال کا غیر معمولی شوق تھا۔ ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں جس میں محاورے استعمال نہ ہوئے ہوں۔ لیکن ناولوں میں ان کا استعمال کچھ زیادہ ہی ہوا ہے۔ بالخصوص توبتہ النصوح میں۔ ان محاوروں کے مواقع استعمال کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ بیشتر جگہوں پر بالارادہ استعمال ہوئے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے غالباً ٹھیک ہی لکھا ہے کہ:

''محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا، تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھونسم ٹھوس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض اوقات ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا۔ ایسے ایسے محاورے ان کی زبان وقلم سے نکل جاتے تھے جو نہ کبھی دیکھے نہ سنے۔'' 22

نذیر احمد نے قرآن کا با محاورہ ترجمہ کیا ہے اور اس ترجمے پر ان کو بڑا ناز تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ:

''اردو ادب میں ان کی جن تصنیفات نے دھوم مچائی ہے وہ ان کے نزدیک بہت معمولی چیز تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری تمام عمر کا اصلی سرمایہ کلام مجید کا ترجمہ ہے۔ ایک ایک لفظ کے ترجمہ میں میرا سارا دن صرف ہو گیا ہے۔ میاں سچ کہنا کیسا محاورہ کی جگہ محاورہ بٹھایا ہے۔ ہم نے کہا'' مولوی صاحب بٹھایا نہیں ہے ٹھونسا ہے۔'' جہاں یہ فقرہ کہا اور مولوی صاحب اچھل پڑے۔ بڑے خفا ہوتے اور کہتے'' کل کے لونڈو! میرے محاورہ کو غلط بتاتے ہو۔ میاں میری اردو کا سکہ تمام ہندوستان پر بیٹھا ہوا ہے۔ خود لکھو گے تو چیں بول جاؤ گے۔'' 23

دیکھیں، چیں بولنا جو اوپر کے اقتباس میں استعمال ہوا ہے عوامی محاورہ ہے، کسی اردو لغت میں نہیں ملے گا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا یہ خیال کسی حد تک درست ہے کہ نذیر احمد کے بہت سے محاورے بے موقع اور غلط استعمال ہوئے ہیں۔ میں یہاں بطور مثال چند

محاورے ان کے ناول ''توبتہ النصوح'' سے نقل کرتا ہوں: اس طرح کی عالم گیر وبا تھی کہ گھر گھر رونا پڑا تھا۔(ص28)، باپ نے قضا کی (ص28)، رشتے کی ایک خالہ تھیں ان کو جاں بحق پایا (ص29)، نواب عمدۃ الملک نے ہیضہ کیا (ص30)، نصوح کو اپنی احتیاط پر کچھ یوں ہی سا تکیہ ہوا تھا (ص30)، وہ سلوک میرے ساتھ کیا کہ تسمہ نہیں لگا رکھا(ص37)، روزے خالی فاقے کے شمار در آئے (ص42)، اچھے ہونے کی شادی کریں (ص50)، یہ آخری محاورہ فارسی مصدر ''شادی کردن'' سے ماخوذ ہے۔

اوپر ہم نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے حوالے سے ان کی نثر کا جو اجمالی جائزہ لیا ہے اس سے واضح ہو گیا کہ وہ اردو کے ایک منفرد نثر نگار تھے۔ اپنے طرز کے موجد بھی اور خاتم بھی۔ ان کے عہد میں اس طرز کی پیروی مشکل تھی اور آج تو ناممکن ہے۔ ان کا نثری سرمایہ خواہ ترجمہ قرآن ہو یا ان کی دوسری تحریریں بالخصوص ان کے ناول، اردو نثر کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو کے ادیب اور نثر نگار اس سے برابر مستفید ہوتے رہیں گے۔

حوالہ جات

1۔ قصہ حسن ودل، فتاحی نیشاپوری کی کتاب ''دستور عشق'' کا اختصار ہے۔
2۔ اس میں کربلا کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔
3۔ سرسید کے مضامین (تہذیب الاخلاق) مرتبہ ملک فضل الدین، ص 451
4۔ دیباچہ مراۃ العروس، ص 2
5۔ توبتہ النصوح، ص 1

6۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی: مرزا فرحت اللہ بیگ، مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1956ء، (مقدمہ مولوی عبدالحق)، ص4
7۔ حوالہ مذکور، مقدمہ مولوی عبدالحق، ص5
8۔ توبتہ النصوح، ص64
9۔ مراۃ العروس، دیباچہ، ص3
10۔ نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی (مقدمہ، مولوی عبدالحق) ص5،6
11۔ مراۃ العروس، ص20،21
12۔ توبتہ النصوح، ص45
13۔ ایضاً، ص127
14۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی، ص91،92
15۔ ابن الوقت، ص241،242
16۔ توبتہ النصوح، ص116،117
17۔ ابن الوقت، ص243
18۔ توبتہ النصوح، دیباچہ، ص22
19۔ ابن الوقت، 129
20۔ ایضاً ص288
21۔ نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی، ص69
22۔ نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی، ص70
23۔ ایضاً ص68

*****

ڈاکٹر اوصاف احمد

1857 کے واقعات اور غالب

دستنبو بنام غالب کے خطوط

ہماری جدید تاریخ میں 1857 کے ''غدر'' سے موسوم واقعات اب بھی کسی عقدۂ لاینحل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب جب کہ ان واقعات پر ڈیڑھ صدی کا عرصہ گذر چکا ہے۔ جذباتیت کو بالائے طاق رکھ دیا جانا چاہیے اور واقعات و معاملات کا حقیقت پسندانہ، عقلی اور غیر جذباتی تجزیہ کیا جانا چاہیے۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوسکا۔ اب بھی مورخین اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ یہ محض ایک جذباتی شورش تھی یا ایک منظم جدوجہد۔ انگریز اب بھی اسے ''غدر'' یا ''سپاہیوں کی بغاوت'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری جانب ہندوستانی اسے '' آزادی کی پہلی لڑائی قرار دیتے ہیں۔ اگر ایک طبقہ اس کو قومی آزادی کی جنگ سمجھنے کے لئے تیار نہیں کہ مسلح جدوجہد میں ہندوستان کے تمام جغرافیائی علاقے اور تمام طبقات شامل نہ تھے تو دوسری جانب وطن پرست مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی فہرست پڑھنے لگتے ہیں جو اس شورش میں شامل تھے اور جو دہلی کے بادشاہ کو اپنی جدوجہد کی علامت مانتے تھے۔ شورش کے اسباب کیا تھے۔ اس کی جغرافیائی حدیں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

تاریخی نقطۂ نظر سے اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، ان پر محققین و مصنفین نے خاصی خاصہ فرسائی کی ہے اور آئندہ بھی یہ موضوعات ان اصحاب کی نظرِ تحقیق و تفتیش سے محروم نہ رہیں گے۔ اس مختصر مضمون میں صرف اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ 1857 کے واقعات کے لئے غالب کی تحریروں میں سے مناسب ترین مآخذ کیا ہیں۔

انیسویں صدی میں غالب اردو ادب کی سب سے قدآور شخصیت تھے۔ ایک زوال پذیر معاشرے میں حساس ترین وجود کے ساتھ انھیں ان تمام تبدیلیوں کا احساس تھا جو ان کے گردو پیش میں ہو رہی تھیں۔ سیاسی اور سماجی اعتبارات سے 1857 میں ہونے والی ''سرکشی'' کے اسباب ایسٹ انڈیا کمپنی کی خودسر پالیسیوں کے سبب عرصے سے جمع ہو رہے تھے۔ سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' میں اس بغاوت کے مندرجہ زیل اسباب گنائے ہیں:

1- غلط فہمی یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا۔
2- جاری ہونا ایسے آئین وضوابط اور طریق حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور ہندوستانیوں کی عادات کے موافق نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔
3- ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار و عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گذرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل پھٹا جاتا تھا۔
4- ترک ہونا ان امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجا لانا ہماری گورنمنٹ پر واجب اور لازم تھا۔
5- بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی[1]

اب دیکھئے ان واقعات کے پیش آنے سے تین چار سال قبل 1854 کے ایک

خط میں غالب، قاضی عبدالجمیل جنوں بریلوی کو لکھتے ہیں:

"مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرع طرح کو کیا کیجیے گا۔ اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چندروزہ ہے۔ اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے ابھی نہ ہو اور اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو۔" 2

خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں کہ غالب نے اس خط میں قلعہ کے زوال کی پیش گوئی تین سال پہلے ہی کر دی ہے۔ 3 غالب اور 1857 کا ذکر آئے تو دستنبو کا ذکر کیوں نہ آئے۔ اس کتاب میں غالب نے ایام غدر کے دوران اپنا روزنامچہ لکھا ہے۔ اس کی زبان "فارسی قدیم" ہے جس سے غالب کو "مناسبت ازلی و سرمدی" رکھنے کا دعویٰ تھا۔ "میں نے آغاز یازدہم مئی 1857 سے یکم جولائی 1858 تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت یعنی 15 مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور اس کا التزام کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے"۔ چونکہ اب اس زبان کے جاننے والے نہیں رہے دستنبو کے اردو ترجمے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خواجہ حسن نظامی نے دستنبو کے خلاصے کا اردو ترجمہ مرزا یعقوب بیگ نامی سے کرایا اور "مرزا غالب کا روزنامچہ" کے عنوان سے 1940 میں کتابچہ کی صورت میں شائع کیا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"دستنبو کا مروجہ نسخہ نول کشوری مطبع کا ہے جو ایسا غلط اور خراب کاغذ پر چھپا ہے کہ اس کا عدم وجود برابر ہے۔ مگر۔۔۔۔صاحب نے اس کی صحت کی پوری جستجو فرمائی۔۔۔۔ دستنبو کا ترجمہ آسان نہ تھا کیونکہ وہ نہایت سخت فارسی میں ہے۔" 4

غالب کی آراء کے بارے میں خواجہ صاحب کی وضاحت یہ ہے:

''غالب نے غدر کے بعد یہ کتاب لکھی تھی جب کہ شرفا خصوصاً مسلمانوں کا سانس خوف اور مایوسی سے گھٹ رہا تھا۔ پس اگر ان کی رائے زنی میں مصلحتِ وقت کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آئے تو موجودہ نسلوں کو اعتراض نہ کرنا چاہیے کیونکہ غالب نے باوجود نزاکتِ وقت بعض باتیں ایسی آزادی و بے باکی سے لکھ دیں کہ کوئی دوسرا دار و گیر کے اس ہولناک وقت میں نہ لکھ سکتا۔'' 5

خود غالب کا بیان اس سلسلے میں یہ ہے:

''میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی چند روزہ جینے کی سرگذشت لکھی ہے۔ تقریباً شہر و سپاہ کا بھی ذکر آ گیا ہے اور اپنی سرگذشت جو میں نے لکھی ہے سو ابتدائے گیارہ مئی 1857 سے اکتیس جولائی 1858 تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں فتح ہوا۔ اس کا بیان بھی ضمناً آ گیا۔ 6

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ 11/ مئی 1857 اور 31/ جولائی 1858 کے درمیان اپنی سرگذشت کیوں کر لکھی ہوگی۔ وہ تو اپنے گھر میں ہی قید تنہائی کاٹ رہے تھے۔ شہر میں ''جرنیلی بندوبست'' (مارشل لا) نافذ تھا۔ نہ یہ کہیں جا سکتے تھے اور نہ کوئی ان کے پاس آ سکتا تھا۔ ''جس دن گورے مجھ کو پکڑ کر لے گئے'' اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا'' 7 اس کے باوجود غالب کو اصرار ہے کہ ان کا بیان سچ ہے اور صرف سچ۔ بلکہ سچ کے سوا کچھ نہیں۔

''اس کتاب (دستنبو) میں شروع سے آخر تک یا ان حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گذر رہے ہیں یا ان واقعات کا ذکر (ہوگا) جو سننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنی

ہونگی یا کچھ کم کے لکھی ہونگی۔ میں دار و گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔"8

چلیے۔ یہ بھی تسلیم کہ غالب نے یہ واقعات ضرور سنے تھے اور جو کچھ انھوں نے سنا اسے بے کم و کاست قلمبند کر دیا۔ لیکن یہ بھی تو معلوم ہو کہ راوی کون ہیں۔ نامعلوم اور مجہول راویوں کے پیش نظر، بیانات کے صحت کی ذمہ داری خود بیان کنندہ پر عائد ہوتی ہے جو وہ لینے کے لئے تیار نہیں۔ اس صورت میں دستنبو کے بیانات کس حد تک قابل اعتبار ہیں، اس کا فیصلہ قارئین خود کر سکتے ہیں۔

دستنبو میں غالب کا بیان کسی غیر جانب دار مورخ کا بیان نہیں ہے ان کے بیانات میں ایک فریق کے حق میں کھلا تعصب پایا جاتا ہے۔ انگریزوں کے قتل پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"افسوس وہ پیکر علم و حکمت، انصاف سکھانے والے، خوش اخلاق، نیک نام حاکم اور صد افسوس۔ وہ پری چہرہ نازک بدن خواتین جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچھ چاندی کی طرح دمکتے تھے۔ حیف! وہ بچے جنھوں نے ابھی دنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحر فنا) میں ڈوب گئے۔"9

فریق مخالف کی شان میں غالب نے جو کلمات لکھے ہیں وہ اس طرح ہیں:

"بُرے سے بُرا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آ سکتا۔ بشرطیکہ وہ ولدالحیض نہ ہو۔ یہ خبیث نمک حرام جس کے منہ پر چیچک کے داغ ہیں، بے حیائی کے سبب جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دہانہ فراخ ہو گیا ہے۔ اپنے

آپ کو زہرہ و مشتری سمجھتا ہے، ہر طرف کولھے مٹکاتا ہوا، انداز دکھاتا ہوا گذرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک دری کو شرماتا ہے۔"10

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زبان بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

دستنبو کی تالیف کے پس پشت غالب کے مخصوص ذاتی، مالی اور سیاسی مفادات پوشیدہ تھے۔ غالب، بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ تھے جنھیں 'باغیوں' نے اپنی جدوجہد کا رہنما قرار دیا تھا اور جنھوں نے خواہی اور نخواہی باغیوں کا ساتھ دیا۔ غالب بہادر شاہ کے خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور تھے۔ 'استادِ شاہ' ذوق کے انتقال کے بعد بادشاہ کے کلام کی اصلاح کا کام بھی ان کے سپرد ہوا۔ سکہ کہنے کا الزام بھی ان پر عائد تھا۔ ان تمام اسباب کی بنا پر غالب کا یہ اندیشہ بے بنیاد نہ تھا کہ کچھ عجب نہ تھا کہ دربار سے قریبی تعلق کی بنا پر انگریز ان کو بھی دھر دبوچیں۔ اس اندیشہ سے گلوخلاصی کی یہی صورت ان کو نظر آئی کہ ''غدر'' کے حالات پر کتاب لکھیں اور اس میں ثابت کریں کہ دربار سے ان کا تعلق برائے نام تھا:

''میں بوڑھا اور کمزور تھا۔ نیز گوشۂ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے بارِ خاطر حاضرین ہو جاتا تھا۔ کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر جمائے ہوئے ہوں۔ مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو کچھ دیر حاضر خدمت رہتا ورنہ دیوانِ خاص میں بیٹھ کر چلا آتا۔"11

دستنبو کی مصنوعی عبارت آرائی کے برعکس عود ہندی اور اردوئے معلّٰی کے خطوط

میں وہ شانِ بے نیازی، وہ بے تکلفانہ تعلق اور وہ تخلیقی ایمانداری ملتی ہے جس نے غالب کو ہم سب کی عزیز ترین ہستی بنا دیا ہے۔ 1857 کے واقعات کے بارے میں غالب کے اصل احساسات سے واقفیت حاصل کرنا ہو تو اس کا مناسب مصدر و مآخذ دستنبو نہیں، غالب کے خطوط ہیں جو برجستہ اور غالباً قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں جن میں کسی قسم کی دانش ورانہ عیاری سے کام نہیں لیا گیا۔ ان کی سادگی اور برجستگی کا احساس خود غالب کو بھی تھا۔ منشی شیو نرائن آرام کو لکھتے ہیں:

> ''اردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔''[12]

چنانچہ 1857 کے واقعات، قلعے کے حالات، دوستوں کے تعلقات سب کے بارے میں ان کے احساسات ان کے خطوط میں بے محابا بیان ہوئے ہیں۔ یہاں نہ پنشن کی طمع ہے، نہ خلعت کی تمنا، نہ گرفتاری کا خوف ہے، نہ رہائی کے منصوبے۔ ذرا دیکھیے تو کہ انتزاعِ سلطنتِ اودھ پر اپنی رائے کس دردمندی اور بے جگری سے دی ہے۔ 23/فروری 1857 کو سید غلام حسین قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

> ''آپ ملاحظہ فرمائیں۔ ہم اور آپ کس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں اور کسی فیض رسانی اور قدر دانی کو کیا روئیں۔ اپنی تکمیل ہی کی فرصت نہیں ۔تباہی ریاستِ اودھ نے باآں کہ بیگانہ محض ہوں مجھ کو اور افسردہ دل کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہونگے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔''[13]

1857 کے واقعات میں چاہے اسے ہنگامہ کہیے، بغاوت کہیے، غدر کہیے، آزادی کی لڑائی کہیے، کتنے گھر خاک ہوئے۔ کتنے بچے یتیم ہوئے، کتنے خاندان اجڑ گئے۔ ایک شہر مٹ گیا۔ ایک تہذیب لٹ گئی۔ غالب کے خطوط میں یہ تہذیبی المیہ اپنے تمام انسانی پہلوؤں کے ساتھ، جس شدت سے نمودار ہوتا ہے اس کی مثال ہندوستانی ادبیات میں مشکل سے ملے گی۔ چند اقتباسات سے یہ نکتہ واضح ہو جائے گا:

''صاحب کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلّی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسے آگے تھی۔ قاسم جان کی گلی، میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ کہ غلام حسین خاں کی حویلی اسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شانِ انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔۔۔ لال کنویں کے محلے میں خاک اڑتی ہے، آدمی کا نام نہیں۔ لکھی کی دوکان میں کتے لوٹتے ہیں۔'' 14

''کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے۔۔۔ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوانِ یغما ہو گیا۔'' 15

''یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی۔ نواب حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسان اللہ خاں، سو ان کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ مع ھذا، یہاں کی اقامت میں تذبذب، خدا جانے کہاں جائیں، کہاں رہیں۔'' 16

''واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ؛ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔۔۔ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔

جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اس کو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں، کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ بادشاہی دفتر سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آتے ہیں میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے تو اس شہر میں ہے کوئی جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی پنج شنبہ۔ پنج دسمبر 1857 تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو معلوم نہیں۔۔۔۔۔۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے۔ مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔'' 17

اللہ اکبر۔ خوف و دہشت کی کیسی سچی تصویریں ہیں جو غالب کے خطوط میں موجود ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ گوروں نے کالوں کو ذبح کیا یا کالوں نے گوروں کو قتل کیا۔ ہندوستانیوں نے انگریزوں کو تاراج کیا یا انگریزوں نے ہندوستانیوں کے برباد کیا۔ ہر لڑائی، ہر جنگ انسانیت کی بربادی کا نمونہ ہے۔ اس میں قاتل اور مقتول دونوں ہی انسان ہوتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں 1857 کی جنگ و تباہی کے تہذیبی اور انسانی المیے اپنی پوری المناکی اور دہشت کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں:

''یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں، جو دکھ مجھ کو

ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریزی قوم سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا، کوئی میرا شفیق، اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار، اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں نہ دشوار ہو جائے، اتنا یاد رہے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔"18

غرض مختصر قصہ یہ کہ اگر کسی کو 1857 کی سچی اور صحیح لفظی تصویریں درکار ہوں تو اس کے لئے مناسب و مؤثر مآخذ دستنبو نہیں بلکہ غالب کے خطوط ہیں۔

حوالہ جات

1- سر سید احمد خاں: اسباب بغاوت ہند

2- غالب: غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، جلد چہارم، بنام قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی، ص 1490

3- خواجہ حسن نظامی: غالب کا روزنامچہ، طبع سوم، 1940، ص۔ 2

4- ایضاً ص۔ 59

5- ایضاً ص۔ 59

6- غالب: غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، جلد سوم، بنام منشی شیونرائن آرام، ص۔ 1055

-7 غالب کے خطوط

-8 1857: ادب، سیاست، معاشرہ مرتبہ احمد سلیم نگارشات، لاہور، ص۔ 94

-9 غالب : دستنبو (اردو ترجمہ۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)، ترقی اردو بورڈ، دہلی، 1994، ص۔23

-10 ایضاً ص۔23

-11 ایضاً ص۔ 20

-12 غالب : غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، جلد سوم، بنام منشی شیو نرائن آرام، ص۔1062

-13 غالب: غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، جلد چہارم، ص۔1416

-14 غالب : غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، جلد چہارم، بنام مولوی عزیز الدین، ص۔1444

-15 غالب: غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، جلد سوم، ص۔ 1084

-16 ایضاً ص 1074 خط مورخہ 12/ جون 1859

-17 غالب : غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، جلد اول، بنام منشی ہر گوپال تفتہ بتاریخ 5/دسمبر 1857، ص۔268

-18 ایضاً بنام منشی ہر گوپال تفتہ جون / جولائی 1858

***

وسیم احمد سعید

انقلاب 1857ء، بہادر شاہ ظفر اور غالب

انداز بیاں اپنا گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

ملک ان دنوں جنگ آزادی کی 150 ویں سالگرہ بہت ہی جوش وخروش کے ساتھ منا رہا ہے۔ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری ادارے، تنظیمیں، ایجنسیاں، لائبریریاں اور منفرد شخصیات جنگ آزادی کے ایک ایک پہلو کو اجاگر کرنے اور نسل نو میں اس کی تشہیر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی ہیں اس سلسلے میں بیشتر سرکاری تقریبات کا انعقاد بھی انتہا درجہ اہتمام کے ساتھ بڑے پیمانے پر کیا گیا۔ اس تمام چہل پہل اور ہنگامے کے درمیان چند اہلِ فکر ونظر جو تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی مانند اس تماشاے شام وسحر کو انگشت بدنداں دیکھ رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ

کیسے کیسے ایسے ویسے ہوگئے
ایسے ویسے کیسے کیسے ہوگئے

گذشتہ دنوں دہلی کے لال قلعہ میں اس عنوان سے سرکاری سطح پر ایک بڑی تقریب کا انعقاد کیا گیا تھا اور اس میں جنگ آزادی کے اکثر مجاہدین کے تذکرے اور اہم واقعات کی جھلکیاں پیش کی گئیں۔ ہم محو حیرت دیکھتے رہے کہ لال قلعہ جیسی اہم شاہجہانی یاد گار کے سبزہ زار پر سب کچھ تھا مگر ایک بدنصیب مجاہد آزادی' اور مغلیہ سلطنت کا آخری تاجدار، ہندوستان کی پہلی ملک گیر و مسلح جدوجہد کا سپہ سالار لال قلعہ کی ایک دیوار پر پورے شاہی لباس کے ساتھ بہ اطمینان محض حقہ پینے سے لطف اندوز ہوتا رہا، گویا اسے احساس ہی نہ ہو کہ تخت و تاج جاتا رہا، ملک جاتا رہا، سارا وطن افراتفری اور آشوب کا شکار ہے، ان سب سے بے پرواہ وہ اپنے ہی عشرت کدے میں جلوہ فگن ، اپنے ہی شوق میں مگن بیٹھا ہے۔

تاریخ کی شاید یہ ستم ظریفی ہے کہ جب اقتدار ایک خاندان ، قبیلے یا قوم سے دوسرے خاندان یا قوم کی جانب منتقل ہوتا ہے، تو گذشتہ فرمانروا کسی نہ کسی بہانے معتوب ہی ٹھہرائے جاتے ہیں بہت کم ایسے دیدہ ور مورخ رہ جاتے ہیں جو حقائق بلا کم و کاست غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگلی نسلوں کو صحیح صورت واقعہ سے واقف ہونے کا موقع دیتے ہیں۔

ہندوستان کی جنگ آزادی کی روداد کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ اس حیثیت سے انکار کی جرأت گستاخی کے مترادف ہوگی کہ 1857 کے محارب عظیم کی متحارب قومیں تین تھیں۔ انگریز، ہندو اور مسلمان۔ چند ماہ جاری رہنے والی اس دوررس نتائج کی حامل جنگ کے پلڑے اوپر نیچے ہوتے رہے اور بالآخر مغلیہ سلطنت ساقط ہوگئی اور اس کی جگہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسیع پسند استعمار کے ہاتھوں گذرتی ہوئی براہِ راست برطانوی

شہنشاہیت کے زیرِ نگیں آگئی۔

برطانوی شہنشاہیت کے مکمل تسلط کے بعد ایک دوسرے محاذ کا آغاز ہوتا ہے جس میں آلات حرب کے بجائے قلم کا سہارا لیا جاتا ہے اور 1857 کی جنگ کے اسباب وعلل، لرزہ خیز حالات وواقعات اور عبرت انگیز نتائج پر اپنے ہی نقطۂ نظر کی تشہیر کے لئے خامہ فرسائی شروع کردی جاتی ہے۔ تصویر کے ایک ہی رخ کو تسلسل سے مختلف پیرائیوں میں بیان کیا گیا ایک ہی مضمون کو سو رنگ سے باندھا گیا اور اس طرح ڈیڑھ صدی سے جاری اس قلمی جنگ نے متحارب گروہوں کی تعداد بھی کم کر کے تین سے دو کردی۔ یعنی مسلمان اور غیر مسلمان۔ اس جنگ میں بھی مسلمان زیادہ پسپا ہوئے اور اور ایک طبقہ انگریزوں سے جاملا اور پھر ان دونوں کے اشتراک سے 1857 کی داستان کو بیان کرنے میں جس جانبدارانہ اور متعصّبانہ اندازِ نظر کا ثبوت دیا گیا وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور لال قلعہ کی مذکورہ سرکاری تقریب میں اسی انداز نظر کا بھرپور مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ یہ ہٹلر کی بیان کردہ اس پالیسی کا مظہر ہے کہ اگر جھوٹ میں اعتماد، تواتر اور مبالغہ آرائی سے کام لیا جائے تو وہی سچ بن جاتا ہے۔

1857 کے اس معرکۂ عظیم کی دو عظیم شخصیتیں، ایک خاندانِ تیموری کا آخری تاجور مگر بے سلطنت شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اور دوسرا اس کے دربار کا عظیم شاعر اسد اللہ خاں غالب ہیں جن کی نگارشات نے انھیں اس معرکہ کا مورخ بنادیا۔ زیرِ نظر مضمون میں 1857 کے اس معرکہ میں ان دونوں شخصیات کے کردار کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر ہندوستان کا وہ آخری مغلیہ تاجدار ہے جس کے پاس سلطنت نام کی کوئی شے نہیں تھی اس کے برعکس بہ حیثیت شہنشاہ بھی محض ایک انگریزی

پنشن خوار تھا۔اس حیثیت سے خاندانِ تیموری کا ایک غیرت مند شہنشاہ کیسی کسمپرسی اور یاس کے عالم میں جیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ مزید برآں قلعہ معلیٰ میں موجود غداروں کی پوری ایک فوج قلعہ کے باہر بے ایمان شہدوں کا ایک ہجوم، عوام میں نفسانفسی کا عالم ،امراء، وروٴسا وشرفاء میں اپنی حیثیت بچانے اپنا وقار بحال رکھنے کے لئے انگریزوں سے درپردہ سازباز رکھنے جیسے پُرآشوب حالات اور خصوصاً وہ حالات جن کا اظہار اس زمانے کے معروف مفکر و مبلغ حضرت مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی تنبیہات میں کیا ہے، کسی بھی بے سلطنت تاجدار کا باطل کے خلاف خروج کیا نتائج پیدا کرسکتا تھا اس کا اندازہ اہلِ نظر آج بھی بخوبی کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ 1857 کی پہلی مشترکہ اور مسلح کاوش بالآخر جس انجام پر منتج ہوئی وہ انہیں حالات کا شاخسانہ ہے۔ چنانچہ گردش ایام اور تغیرات زمانہ کا اسیر اگر بے عمل گھر بیٹھ جائے تو اس پر آرام طلبی، عیش پسندی نااہلی اور سوئے ہوئے دل ودماغ رکھنے کا الزام لگانا مزید ایک ظلم ہے۔

تاریخ کے عمیق مطالعے کے ذریعے شاید یہ ثابت کرنا مشکل ہو کہ بہادر شاہ ظفر ایک مخلص، جری مجاہد آزادی تھے مگر ناکامی 1857 کے سارے الزامات بہادر شاہ ظفر کے حساب میں لکھنا بھی بددیانتی ہوگا۔ممکن ہے کہ دورجدید میں قوم پرستی کی تعریف کرنے والے لوگ گاندھی، نہرو، اور آزاد کے طرزتحریک کو ہی حب الوطنی پر محمول خیال کرتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں حب الوطنی کا یہ معیار بھی بدل جائے لیکن ایک ایماندار اور غیر جانبدارانہ تجزیہ نگار جب بھی قوم پرستی اور حب الوطنی کا تذکرہ کسی شخصیت کے حوالے سے کرے گا تو اس شخصیت کے زمانے میں موجود حالات کے پیشِ نظر ہی جذبہٴ قوم پرستی کی تعریف بھی متعین کرے گا۔لہذا جن تجزیہ نگاروں اور مورخین کا یہ خیال ہے کہ بہادر شاہ ظفر محض اپنا تاج وتخت اپنی شہنشاہیت اور اپنی سلطنت کی واپسی کے

غرض سے میدانِ کارزار میں آئے تھے ان کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ آمرانہ طرزِ حکومت میں تاج وتخت اور سلطنت کی بقاودوام کی جدوجہد ہی دراصل حب الوطنی اور جذبۂ قوم پرستی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہارانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے اور اطرافِ دلی کے اکثر غیر مسلم راجاؤں نے بھی اپناراج پاٹ، نوابتیں، اور جاگیریں بچانے کے لئے محض اس امید پر بہادر شاہ ظفر کو شہنشاہِ ہندوستان قبول کر کے تحائف اور نذریں گزاری تھیں کہ شاید ایسٹ انڈیا کمپنی سے نجات حاصل ہوجائے اوران کی جاگیریں، تحصیلیں، اورنوابتیں بلاشرکتِ غیران کے تصرف میں بحال ہوجائیں۔

اس میں شک نہیں کہ بہادر شاہ ظفر کی تربیت وپرداخت اس ماحول میں ہوئی تھی جس میں حرارت کم اور جمود زیادہ ہوتا تھا۔ وہ ماحول جہاں شطرنج وگنجیفہ کی بازیوں، رقص وسرود کی محفلوں اور شعروشراب کی رنگینوں کے پردے اتنے دبیز ہوتے تھے کہ بیرونی دنیا کا خلفشار کسی طرح نظر نہیں آسکتا تھا، جہاں شہزادوں اور بادشاہوں کے مصاحبین اپنے ''آقاؤں'' کا حق نمک خواری ادا کرنے کے لیے انہیں ہر لحظہ خواب آور کیفیات میں مبتلا رکھتے تھے، ایسے ماحول میں پرورش پانے والے شہزادوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ تختِ شاہی پر پہنچ کر جہانبانی وجہانگیری اوراولوالعزمی وفتح مندی کے پھریرے اڑائیں گے، ایک غلط توقع ہے مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بہادر شاہ ظفر اسی ماحول میں پروان چڑھتے ہیں کہ قلعے کے باہر کی دنیا ان کے حق میں قطعی سازگار نہیں رہی تھی۔ اورنگزیب عالمگیر کے انتقال کے بعد مغل شہزادوں نے حصولِ اقتدار کے لیے جورسہ کشی شروع کی تھی اوران کی باہمی منافقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں کے گورنروں نے جو خودسری اختیار کی تھی، وہ اپنا رنگ لاچکی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے خلاف بچھایا ہوا سازش کا جال بہت مضبوط ہوچکا تھا اوراب صورت یہ تھی کہ اس جال میں پھنسا ہوا شکار آزاد ہونے کے لیے جتنے ہاتھ

پاؤں مارتا تھا' جال کے حلقے اتنے ہی تنگ ہوتے جارہے تھے۔

ان حالات میں بہادر شاہ ظفر کے علاوہ خواہ کوئی بھی ہوتا' وہ مغلوں کی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ واپس نہیں لاسکتا تھا' اس لیے مغلیہ سلطنت کی تباہی میں بہادر شاہ ظفر کو نااہل 'عاقبت نااندیش اور کوتاہ بیں قرار دینا درست نہیں ہے۔ اگر یہ الزامات عائد ہوسکتے ہیں توان لوگوں پر جنہوں نے اورنگزیب کے بعد تخت حاصل کرنے کے لیے اوچھے ہتھیار استعمال کیے اور دوسری طرف عیش وعشرت میں مبتلا رہ کر نہ صرف اپنے پیروں پر کلہاڑی چلائی بلکہ پورے ملک اور ساری قوم کو تباہی کے عمیق غار میں ڈھکیل دیا۔ بہادر شاہ ظفر کا صرف اتنا قصور ہے کہ وہ ایسے وقت میں تخت پر بیٹھے جب ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ 1857ء کے واقعات بالکل غیر متوقع طور پر پیش نہیں آئے۔ یہ ایک منظم لائحہ عمل تھا جو کچھ صوبوں اور ریاستوں کے عوام اور ہندوستان کی فوجوں نے مغربی غاصبوں سے اپنا ملک واپس لینے کے لیے وضع کیا تھا اور اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے قابل اور تجربہ کار دماغ کام کر رہے تھے۔ خصوصاً جب ہم سازش کے اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ دنیا کی ایک بیدار مغز سیاستدان اور فاتح قوم کی موجودگی میں ہندوستانی عوام اور فوج اور والیان ریاست اس کے خلاف منصوبے بناتے رہے، فوج کی مختلف کمپنیاں آپس میں پیغام رسانی کرتی رہیں، سول اور فوج کے افسران ایک دوسرے سے خط وکتابت کرتے رہے۔ بغاوت کے سارے طریق کار وضع کیے گئے تھے۔ جنوری 1857 میں رانی گنج کے مقام پر ایک انگریز کی کوٹھی اور تار گھر جلا کر پورے ملک کو بغاوت کے لیے تیار رہنے کی اطلاع دے دی گئی اور چپاتیاں تقسیم کر کے اس کی علامتیں ظاہر کی

گئیں، مگر یورپ کی یہ دانا وبینا اور چاق و چوبند قوم مطلق نہ سمجھ سکی تو ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سازش کنندگان بہت ہی اعلی اور منظم طریقے سے کام کر رہے تھے اور یقیناً انہیں بہترین دل و دماغ رکھنے والوں کی سرپرستی اور تعاون حاصل تھا مگر ان باتوں سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا ہے کہ ان سرپرستوں میں بہادر شاہ بھی شامل تھے۔ تھوڑی سی دور چلنے کے لیے بھی انہیں عصا کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ دربار میں بیٹھے بیٹھے ان پر ضعف دل کے دورے پڑتے رہتے تھے۔ اتنی عمر اور اتنا کمزور جسم رکھنے والے بوڑھے سے یہ توقع رکھنا بعید از عقل ہے کہ وہ از خود فوجوں اور والیان ریاست کو اکسا کر اتنے بڑے پیمانہ پر قتل و خونریزی کا بازار گرم کرائے گا اور ایک مستحکم حکومت کے خلاف اعلان جنگ کرے گا جس کی قیادت بھی خود اسی کو کرنی ہے۔ اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ممکن ہے بہادر شاہ نے خود سازش کا کوئی منصوبہ نہ بنایا ہو بلکہ انہیں سازش کنندگان نے دعوت دی ہو جسے انہوں نے قبول کر لیا ہو لیکن یہ بات بھی قرین قیاس نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت بہادر شاہ انگریزوں کے زیرِ اثر تھے اور انگریز انہیں آرام و آسائش پہنچانے کے لیے ان کی ہر ممکن خاطر داری کرتے تھے۔ انگریزوں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے اور انگریز حکام قلعے میں آتے جاتے تھے۔ دلی کے چپے چپے پر اور خصوصاً لال قلعے میں مرزا الٰہی بخش جیسے لوگ موجود تھے جو انگریزوں کو بہادر شاہ کی نقل و حرکت کی خبر دیتے تھے۔ سازش کنندگان اور ان کے سرپرست ان باتوں سے بے خبر نہیں تھے۔ ان حالات میں باغیوں کا بہادر شاہ کو سازش میں شریک کرنا یا ان سے سرپرستی کے لیے درخواست کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا کیونکہ انہیں ہر وقت اندیشہ ہوسکتا تھا کہ کہیں بہادر شاہ یا قلعے کا کوئی اور درباری اس سازش کو بے نقاب نہ کردے۔ اس لیے قرین مصلحت بھی یہی تھا کہ اس منصوبے کو بہادر شاہ اور اہلِ قلعہ سے پوشیدہ رکھا جائے اور جس وقت باغی فوجیں دلی میں داخل ہوں

اس وقت بہادر شاہ سے تخت پر بیٹھنے کی درخواست کی جائے۔ اپنے آپ کو باغی افواج کے درمیان دیکھ کران کے پاس باغیوں کی خواہش پوری کرنے کے سوااور کوئی چارہ نہیں ہوگا اور یوں بھی مغلیہ سلطنت کادوبارہ قیام دیکھ کرانہیں عنان حکومت سنبھالنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک باغی فوجیں دلی میں داخل نہیں ہوئیں، بہادر شاہ نے بغاوت کا مرکزی کردارادانہیں کیا تھا جبکہ فوجوں کے افسروں نے بہادر شاہ سے درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے سروں پر ہاتھ رکھیں......اور ہندوستان کے تخت کو زینت بخشیں۔اس تاریخی تقریر کے دو اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

''سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ بنائے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی۔ میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی ہے۔ میرے آباواجداد کے نوکر چاکر (صوبوں کے گورنر) اپنے خاندان نعمت کی اطاعت سے (سرکش ہوکر) جداگانہ رئیس بن بیٹھے''۔

میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا۔قوت لایموت کومحتاج ہو گئے. ...

''......میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں، مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے نوکر رکھ لوں گا۔ میں کچھ نہیں کرسکتا ہوں۔ مجھ سے کسی طرح کی توقع استعانت کی نہ رکھو......''

(داستان غدر مصنف راقم الدولہ ظہیر دہلوی)

اس تقریر کے ایک ایک لفظ سے بہادر شاہ کی بے بسی اور شکستگی ظاہر ہو رہی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے باغی فوجوں کو ان کے اقدام سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن باغی افواج کے سرداروں نے بہادر شاہ کی خدمت میں درخواست کی کہ ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ ہم نہ آپ سے روپیہ طلب کرتے ہیں نہ فوج مانگتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہم حضور کے اقبال سے آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ حضور ہماری سرپرستی فرمائیں اور ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہو جائیں۔ بہادر شاہ کے لیے اس وقت دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ باغیوں کی سرپرستی کرتے یا ان سے کنارہ کش ہو جاتے اور آخر کار انگریزوں کی پناہ میں چلے جاتے، مگر انہوں نے ایک غیور انسان کی طرح پہلا راستہ اختیار کیا اور یہ دیکھ کر کہ باغی کسی طرح انگریزوں سے مصالحت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، عنانِ حکومت سنبھال لی اور پھر آخر تک ڈٹ کر انتہائی دلیری سے مشکلات کا مقابلہ کیا۔

بہادر شاہ نے عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں کیا کردار ادا کیا، اس سوال کا ابھی تک کوئی فیصلہ کن جواب نہیں دیا جا سکا۔ بغاوت سے متعلق اب تک جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کے بیشتر حصے سے جانبداری کی بُو آتی ہے اور اس جنگ آزادی میں بہادر شاہ کی پوزیشن انتہائی مضحکہ خیز دکھائی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہادر شاہ اپنے درباریوں اور شہزادوں کی کمزوریوں سے پوری طرح واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ چند آدمیوں کے علاوہ باقی لوگ حکومت کا نظام چلانے کی اہلیت سے محروم ہیں۔ انہیں انگریزی سلطنت کے استحکام اور ہندوستانیوں کے نفاق و عیش پرستیوں کا بھی علم تھا، مگر ان سب چیزوں کے باوجود انہوں نے یہ سمجھ کر عنانِ اقتدار سنبھال لی کہ بیشتر ہندوستانی افواج باغی ہو گئی ہیں اور بعض والیانِ ریاست بھی تعاون کا یقین دلا رہے

ہیں۔عوام بھی انگریزوں سے برگشتہ ہیں۔ ان حالات میں شاید مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ میرے ہاتھوں سے دوبارہ روشن ہوجائے۔ یہ الگ بات ہے کہ باغی سرداروں نے انہیں غلط قسم کی امیدیں دلائیں اور پھر آپس کی ناچاقیوں، غداریوں، سازشوں اور مغل شہزادوں کی بے موقع دخل اندازیوں سے یہ جنگ آزادی بری طرح ناکام ہوگئی، مگر 11 مئی 1857ء کو ہندوستانیوں کی سربراہی قبول کرنے والا بہادرشاہ ہر موقع پر نہایت ہی پامردی کا مظاہرہ کرتا رہا اور اسی کی توجہ وسرپرستی کا نتیجہ تھا کہ یہ جنگ چند ماہ جاری بھی رہی اور اس دوران انگریزوں کو جانی اور مالی نقصان عظیم برداشت کرنا پڑا اور بعض دفعہ تو ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید اب انگریزی سلطنت چند گھنٹوں کی مہمان ہے۔اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد بھی کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ انگریزوں کو اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا اور ملکہ وکٹوریہ کو اعلان کرنا پڑا کہ اب ہندوستانیوں کے مذہبی معاملات میں حکومت بالکل دخل نہیں دے گی۔ ان کی جان ومال اور عزت وآبرو پوری طرح محفوظ رہیں گی اور انہیں ایوانِ حکومت میں مشورے دینے کے لیے بھی شریک کیا جائے گا اور کچھ عرصہ کے بعد ہندوستان میں وہ اصلاحات بھی جاری کردی گئیں جو آخر کار انگریزوں سے مکمل آزادی لینے پر منتج ہوئیں۔

صاف ظاہر ہے کہ بہادرشاہ نے جب باغی فوجوں کی سربراہی قبول کرلی تو پھر پوری طاقت سے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی اور بہ نفس نفیس آخر تک اس کی نگرانی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب باغی فوجیوں کے حوصلوں میں کچھ شکستگی نظر آنے لگی تو انہوں نے گرج کر کہا کہ اگر تم نے پوری شدت سے انگریزی فوجوں کا مقابلہ نہ کیا تو میں قلعہ چھوڑ دوں گا اور خود تلوار لے کر میدان میں نکلوں گا اور آخر کار ایک وقت ایسا بھی آگیا جب بیاسی برس کا یہ بوڑھا اپنے کمزور اور لرزیدہ جسم کے ساتھ سامانِ

حرب سے آراستہ ہوکر گھوڑے پر چڑھ گیا اور باگ کو مورچے کی طرف پھیر دیا۔اگر دربار شاہی کے ارکان اور باغی فوجوں کے سردار سامنے آکر بہادر شاہ کا راستہ نہ روک لیتے تو ہوسکتا تھا کہ رنگون کے تنگ وتاریک کمرے میں مرنے کی بجائے خاندان تیمور کا یہ آخری جانشین میدانِ جنگ میں موت کا استقبال کرتا۔اور بہادر شاہ ظفر کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ ؂

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

مرزا اسداللہ خاں غالب ہمارے عہد کا قومی اردو شاعر، بہادر شاہ ظفر کا اتالیق، استاد اور دربار مغلیہ کا شاہی شاعر ہونے کے ناطے شہرت تام کا حامل ہے اپنی اردو اور اس سے زیادہ مشہور فارسی شاعری، اور اردو زبان میں اپنے خطوط کے ذریعے سہل نگاری کے اختراع کے لئے مشہور اس شاعر نے اپنے پرآشوب زمانے کی مورخی کی بھی خدمت انجام دی ہے۔ ہر چند کہ غالب کی نثر کا نسبی سلسلہ نامعلوم ہے لیکن ان کے ایک شعر سے ان کے نسبی پیشہ وری کا اندازہ ہوتا ہے ؂

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مگر غالب کی اس نسبی پیشہ وری 1857ء کی جنگ آزادی میں محض قلمی سپہ گری پر محمول رہ گئی اور ''دستنبو'' کے ذریعے غالب نے اس مجاہدہ کی تاریخ نویسی کی خدمت انجام دیتے ہوئے اس زمانے کے حالات کی ڈائری مرتب کی اور روزنامچہ کے ساتھ اپنے زمانے کے عوامی اخلاق واطوار، سماجی بے راہ روی، دینی زبوں حالی اور جنگ آزادی کی

ناکامی کے اسباب کی جانب بھرپور اشارے کئے ہیں ہر چند کہ ایک چابکدست شاعر کی حیثیت سے اسی ڈائری کے ذریعے غالب نے انگریزوں سے اپنی پنشن جاری کروا کے اپنے مستقبل کو بھی محفوظ کیا لیکن اس سے دستنبو کی تاریخی اور دستاویزی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ذیل میں ہم غالب کی اس تصنیفی خدمت خصوصاً دستنبو کا اجمالی خاکہ پیش کرر ہے ہیں۔

یہ واضح طور پر معلوم نہیں کہ مصنف نے یہ بے نظیر دستاویز کیوں مرتب کی۔ بہر حال اس کی اشاعت انگریزوں کے دہلی پر مکمل قبضے کے بعد ہوئی۔ یہ قیاس کرنا چنداں غلط نہ ہوگا کہ اس کتابچہ کے اصل متن میں صورت حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مناسب ترمیم کی گئی تھی۔ غالب کے موجودہ روزنامچہ میں واقعات کا بیان بہت مختصر ہے لیکن بعض اہم حقائق کا ذکر تک نہیں حالانکہ وہ عوام کے علم میں تھے۔ خصوصاً بہت سے اہم اور پُر معنی واقعات پر کم توجہ دی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو روزنامچہ پر نظر ثانی کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اس نے اسی پر اکتفا کیا کہ بعض عبارات کو محذوف کر دیا جائے اور بعض کا بعد میں خیال آنے پر اضافہ کیا گیا۔ یہ سب غالباً جان بچانے کے لئے کیا گیا ہوگا۔

داستان سرفروشی کے عالم میں شروع ہوتی ہے جب ہر طرف عوامی بغاوت زوروں پر تھی اور پہاڑی پر انگریزی فوجی دستوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف سمتوں سے ہندوستانی فوجیں دہلی کی جانب بڑھ رہی تھیں لیکن جوں ہی لڑائی شروع ہوئی، جو چار مہینے دس دن تک جاری رہی...... مصنف کی خاموشی بڑھتی گئی اور اُس نے چپ سادھ لی۔ عام کیفیت کے بیان کی چند سطروں کے بعد ہمیں یکایک بتایا جاتا ہے کہ "کشمیری دروازے

پر انگریزوں کے حملے کے مقابلے میں ہندوستانی فوجوں کے لیے سوائے پسپا ہونے کے کوئی چارہ نہ رہا۔ اب وہ اصل موضوع سے گریز کرتا ہے اور ملک میں تحریک مزاحمت کے چند اتفاقی مگر حقیقت افروز حوالوں کے سوا وہ زیادہ تر اپنے خانگی مسائل اور سابقہ دور میں انگریزوں کے تئیں اپنے خاندان کی خدمات کے ذکر پر متوجہ ہو جاتا ہے۔

بغاوت کی تفصیلات پر بحث سے متعلق مصنف کی خاموشی اور غیر ملکی فاتحین کے تئیں اس کی وفاداری کے دعووں کی حقیقت اور وقعت کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ہم اس وحشیانہ قتل عام کو ملحوظ رکھیں جو اُس وقت جاری تھا۔ بغاوت میں اس کی شرکت کے ذرہ برابر بھی گمان پر اسے یقیناً پھانسی پر چڑھا دیا جاتا۔ اس کے علاوہ غالب معاش کے لیے پنشن پر انحصار رکھتے تھے اور اس سے پیشتر کہ حکام اس کی بحالی پر آمادہ ہوتے، انہیں اپنے خلوص نیت کا ثبوت بہم پہنچاتا تھا۔ یہ اُس شخص کے لیے اور بھی زیادہ ضروری تھا جو طبقہ امرا سے تعلق رکھتا تھا اور دہلی کے مغل بادشاہ بہادر شاہ کا اتالیق، درباری اور ندیم رہ چکا تھا۔ اگرچہ وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے جدید تہذیبی اثرات کو سراہتے تھے۔ لیکن انگریزوں کی جارحانہ پالیسیوں بالخصوص اودھ کے الحاق کو قبول نہ کر سکتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب مارشل لا کی سختیوں میں ڈھیل ہوئی اور امن وامان کی حالت بحال ہوئی تو غالب انگریزوں کے جور وستم کی زیادہ کھل کر مذمت کرنے لگے۔ وہ جاگیردار شرفا کی اس خام خیالی سے متفق نہ تھے کہ نئے حکمراں اُن کو سیاسی اقتدار میں شریک کریں گے۔ انہوں نے عام طور پر اپنے باغی ساتھیوں اور شکست خوردہ طبقہ امرا کے مصائب کے لیے کھلے بندوں ہمدردی کا اظہار کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ستمبر 1857ء کے وسط میں حالات دگرگوں ہو گئے

توانہوں نے اپنے بہت سے دوستوں کی طرح اپنی سلامتی کو ہر چیز پر ترجیح دی۔ اس لیے اگرانہوں نے حکام کے سامنے اپنی بریت کی پُرزور وکالت کی تو اس کے لیے انہیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ انہوں نے عذر پیش کیا کہ ''میرا خاندان ہمیشہ انگریزوں کا نمک حلال رہا ہے اور اسی بنا پر مجھے زندگی بھر کے لیے پنشن عطا ہوئی ہے۔ بغاوت کے ایام میں مَیں نے نہ شاہ پرستوں اور باغیوں دونوں سے اپنے آپ کو سختی کے ساتھ الگ تھلگ رکھا ہے بلکہ درحقیقت میں اپنے مکان میں محبوس رہا ہوں۔ انگریزی فوجی دستوں کے داخل ہونے کے بعد بھی میں نے شہر میں ٹھہرنا پسند کیا حالانکہ بہت سے رئیس اور پنشن خوار بھاگ گئے۔ بغاوت میں اپنی عدم شرکت کے ثبوت میں انہوں نے ہندوستان اور انگلینڈ میں اعلیٰ حکام کی خدمت میں اپنا فارسی روزنامچہ (دستنبو) پیش کیا۔ اس کی وجوہات معلوم کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ایہام گوئی میں استاد ہونے کے سبب یہ طرز انیسویں صدی کے مغل دربار کے اہل ادب میں مقبول تھی وہ شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے بھی اس کو چھپانے میں مہارت رکھتے تھے۔ اپنے طرزِ کلام اور مفہوم دونوں میں ایہام کو بڑھانے کے لیے اس موقعہ پر غالب نے فارسی زبان کی ادبی پاکیزگی کے حق میں اپنے تعصب سے فائدہ اٹھایا۔ غرض کہ انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان کے روزنامچے کو خود یا ان دوستوں کے خلاف جنہوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا' ثبوت کے طور پر استعمال نہ کیا جاسکے۔

لیکن اس سے دہلی میں بغاوت سے متعلق بعض واقعات کے لئے معتبر اور مآخذ کی حیثیت سے ''دستنبو'' کی وقعت کم نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ مصنف کا شوق راست گوئی اور جذبۂ انسان دوستی اس کتاب کی ایسی ہی خصوصیات ہیں جیسا کی دوسری تصنیفات۔ ظاہر اسباب کی بنا پر واقعات کا بیان بے شک مبہم سا ہے۔ غالبؔ اس جزوی داستان میں بھی قومی مزاحمت کی اس عظیم تحریک کی گرمجوشی سے ہمیں آگاہ

کرنے اوراس سے پیدا ہونے والی نئی سماجی قوتوں کی جھلک دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ غالبؔ کے فارسی روزنامچہ کا موجودہ نسخہ، اپنی کمیوں کے باوجود، 1857ء کے واقعات کے ہر ایماندار طالب علم کے لیے ایک بیش قیمت دستاویز ہے۔

1857ء کی جنگ کو ہندوستان کی تاریخ یقیناً کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ ارباب اقتدار اس جنگ کے ہیروز، حقائق، طریق کار، مقصد میں حرف زنی کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ مگر اس حقیقت کا انکار بھی ممکن نہیں کہ جھوٹ، مکرو فریب کے ایک گھٹاٹوپ اندھیرے میں سچ کا ایک چھوٹا سا دیا بھی جھلملاتا رہا تو اس کی مدھم سی روشنی میں آنے والی نسل تک یہ سچ ضرور پہونچ جائے گا، ہوسکتا ہے کہ اس اثناء میں سچ کے علمبردار جھوٹ کی اس اندھیری کوٹھری میں نقاہت اورضعف کی زنجیروں میں پابستہ رینگتے رہیں اورجھوٹ کے دیو ہیکل ان کے سینوں کو کچلتے رہیں' تغیر پذیر زمانہ کروٹ ضرور بدلے گا اور آنے والا کل دیکھے گا کہ آزادی کی جس نعمت سے نسل نو ہمکنار ہے اس کی بنیاد کو ظفر و غالب جیسے شاہ وگدا کے ساتھ کشمیر سے کنیا کماری اور رنگوں سے انڈومان نکوبار کی جیلوں تک لاکھوں سرفروشانِ اسلام، علماء کرام اورکڑیل جوانوں کے خون کی آمیزش نے استحکام بخشا ہے۔ لہٰذا اسی امید پر۔

ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے

جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

*****

احسان آوارہ

غالب اور باندہ

محترم جناب ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب نے اپنے ایک خط مورخہ 17 جون 2007 (خط آخر میں شامل کیا جارہا ہے) میں مرزا غالب کے سفر کلکتہ کے درمیان باندہ (بندیلکھنڈ) سے باندہ ضلع کے قصبہ چلّہ تارہ کے سفر کے متعلق کچھ اعتراضات اٹھائے تھے۔ اس سلسلے میں زمینی حقائق کے پیش نظر جو تفصیل انھیں تحریر کی گئی اس کا خلاصہ یہاں پیش کرتے ہوئے یہی کوشش ہے کہ اہل علم ان حقائق کی روشنی میں اس سلسلے میں کی گئی غلطیوں پر غور فرمائیں اور اپنی آراء سے مطلع کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں تا کہ مرزا کے اس متنازعہ سفر کا خلاصہ ہوسکے۔ اس سلسلے میں سید اکبر علی ترمذی بھی غلط فہمی ہوئے ہیں اور انھوں نے ''نامہ ہائے فارسی غالب'' مطبوعہ 1969 میں اپنے انگریزی مقدمے میں مرزا کے اس سفر کا ذکر کرتے ہوئے ''مودہا'' جانے کی بات کہی ہے۔ اس کے علاوہ مالک رام صاحب کے سہ ماہی رسالے ''تحریر'' مطبوعہ اکتوبر 1972۔۔۔ میں مشتاق شارق میرٹھی کے مضمون ''غالب اور بندیلکھنڈ'' سے بھی یہ غلطی در آئی ہے جس کی بنا پر اہل تحقیق اسی کو دوہراتے چلے آرہے ہیں۔ زمینی حقائق کی جانب کسی نے بھی توجہ نہیں فرمائی۔

ڈاکٹر موصوف کا ارشاد تھا :

''زمینی حقائق کے متعلق آپ نے جو معلومات پیش فرمائی ہیں اس کے پیش نظر یہ طے ہے کہ غالب باندہ سے فتحپور (چلّہ تارہ) جاتے ہوئے ضلع ہمیر پور سے نہیں گذرے تھے۔''

یہ بات تسلیم کرتے ہوئے موصوف نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ:

''لیکن میں آپ کی اس رائے سے بھی متفق نہیں ہوں کہ ''مودہ'' دراصل ''موڈہ'' ہے۔

اپنے اس ارشاد کے جواز میں وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''آپ نے 1874 کے نقشے پر انحصار کیا ہے اور غالب نے 1827 میں اس علاقے میں سفر کیا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ اس وقت باندہ سے چلہ تارہ تک پکی سڑک موجود ہو؟''

اپنے اس اعتراض کو مزید تقویت دینے کی غرض سے موصوف نے مرزا کے دہلی سے رام پور کے سفر کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ:

''غالب جن راستوں سے گذرے ان میں سے کئی مقامات اب اس راستے میں نہیں آتے، نہ ٹرین کے سفر میں نہ بس کے سفر میں اور نہ ہی بیل گاڑی کے سفر میں۔''

اور پھر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ:

''باندہ سے ''مودہا'' گاؤں ہوتے ہوئے چلّہ تارہ گئے ہوں گے۔ غالب نے ''مودہ'' لکھا ہے۔ اس لئے زیادہ قیاس آرائی مناسب نہیں۔''

راقم الحروف نے ان کے اعتراضات کے حوالے سے جو حقائق ان کی خدمت

میں ارسال کیئے۔ وہ اس بنیادی یقین کے ساتھ کہ باندہ اور چلہ تارہ کے درمیان یہی وہ واحد سڑک تھی چاہے وہ 1827 میں کچی یا پکی رہی ہو اور مرزا نے بیل گاڑی سے اسی پر سفر کیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کیا کہ:

(الف) 1874 کے نقشے جو باندہ اور ہمیر پور اضلاع سے متعلق ہیں، کلکتہ کے سروئیر جنرل کے دفتر کے تیار کردہ ہیں۔ (ماہ فروری 1874) جو انگریز سروئیر مسٹر ایڈ ون۔ ٹ۔ اٹکنسن کی سروے رپورٹ میں منسلک تھے۔ (فوٹو کاپی ڈاکٹر صاحب کو بھیجی گئی تھی) 1

ان نقشوں کے بموجب جو حقائق زمین پر موجود ہیں ان کے مطابق باندہ سے چلہ تارہ جاتے ہوئے ضلع ہمیر پور کی تحصیل ''مودہا'' جانے کی خاطر مرزا کو باندہ شہر کے مغرب میں واقع دریائے کین (Ken) کو ناؤ کے پل سے پار کر کے جانا پڑتا۔ پھر مغرب کی جانب پختہ سڑک جو ساگر کو جارہی ہے، اس پر کچھ دور چل کر شمال کی جانب کچی سڑک سے ''مودہا'' جانا پڑتا۔

(ب) ''مودہا'' ہمیر پور سے چلہ تارہ (ضلع باندہ) میں داخل ہونے کے لئے کوئی راستہ نہ تب تھا نہ اب ہے۔ لیکن دریائے کین (Ken) جنوب سے شمال کی جانب بہتا ہے اور چلہ تارہ میں جا کر دریائے جمنا میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اس درمیان کوئی ناؤ کا پل نہیں پڑتا تھا (آج موضع پیلانی میں سڑک کا پل تعمیر ہو چکا ہے جس سے باندہ کی حدود میں داخل ہوا جاتا ہے) کہ جس کے ذریعہ مرزا پھر باندہ ضلع کی حدود میں داخل ہو کر چلہ تارہ پہنچتے۔ اس کے لئے انھیں پھر باندہ واپس آنا پڑتا۔

(ج) آج مرزا کے سفر کو تقریباً 180 سال ہو چکے ہیں۔ اب سوائے قدیم ریکارڈ یا اس کے متعلق زمینی حقائق پر بنیاد قیاس کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ مرزا نے

15/نومبر 1827 کو یہ سفر باندہ سے شروع کیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ان کا اس سڑک پر پہلا پڑاؤ ''موڈا'' (مودہ یا مودہا) تھا۔ اٹکنسن نے اپنی سروے رپورٹ کے صفحہ 75 پر ایک چارٹ درج کیا ہے (فوٹو کاپی منسلک ہے) جس میں باندہ سے ان مقامات تک کے فاصلے درج ہیں جہاں 2 ہزار نفوس کی آبادی تھی۔ اس کے مطابق اس سڑک پر جو پہلا گاؤں آتا وہ موئی بزرگ (Mawai Buzurg) ہے دوسرا موڈا ہے جس کا تذکرہ نہیں ہے کیونکہ وہاں کوئی آبادی اس وقت نہ تھی۔ تیسرا مقام پپر یندا (Paprenda) اور چوتھا مقام اتراہٹ (Atrahat) ہے۔ سروئیر کے مطابق ان کے فاصلے باندہ سے حسب ذیل تھے:

باندہ سے موئی بزرگ ۔ 4 میل

باندہ سے پپر یندا ۔ 10 میل

باندہ سے اتراہٹ ۔ 14 میل

موڈہ جو موئی بزرگ اور پپر یندا کے درمیاں واقع ہے۔ یہاں سڑک پر دو خطرناک موڑ پڑتے ہیں۔ ایک قدیم کنواں تھا جو آج بھی ہے۔ اس وقت یہاں چند جھوپڑے ہوا کرتے تھے۔ اس سڑک پر چلنے والا سارا ٹریفک یہاں پڑاؤ ڈالتا تھا۔ اس لئے موڑوں کی بنا پر اس کا نام موڈا ہوا کرتا تھا۔

اس طرح جب موئی بزرگ باندہ سے 4 میل اور پپر یندا 10 میل پر واقع تھا تو یہ مقام موڈہ باندہ سے تقریباً 7 میل پر ہوگا۔ راقم الحروف نے اپنی ملازمت کے دوران اتراہٹ سے موڈہ تک سفر پیدل کیا تھا صرف یہی دیکھنے کے لئے کہ مرزا کس طرح یہاں سے گذرے تھے۔ یہ عملی تحقیق تھی۔

(د) یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ مرزا تنہا سفر نہیں کر رہے تھے ان کے ہمراہ تین نوکر، ایک سائیس، ایک کہار، گھوڑا اور گاڑی بان بھی تھے۔ جہاں مرزا نے پڑاؤ ڈالا وہاں کوئی بورڈ، گاؤں کے نام کا نصب نہیں تھا، نہ ہی آبادی تھی۔ اس لئے مرزا نے اس مقام کا نام ان ہی لوگوں سے دریافت کیا ہوگا۔ اور ان لوگوں نے تبدیلی بولی میں موڑوں کی بنا پر ''موڈہ'' بتایا ہوگا جو عرف عام میں مشہور تھا۔ مرزا نے وہی اپنے خط بنام مولوی محمد علی خان، صدر امین باندہ میں تحریر کیا تھا۔ یہ بات دریافت طلب ہے کہ مولوی صاحب کو لکھے گئے اصل خط میں کیا درج تھا موڑا، موده یا مودہا۔

سید اکبر علی ترمذی نے نامہ ہائے فارسی غالب، 1969 کی شروعات میں اپنے انگریزی مقدمے میں صفحہ xxiii (23) پر لکھا ہے:

''مسودہ شکستہ طرز پر کالی سیاہی سے ہاتھ کے بنے کاغذ پر تحریر ہے''

اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ منشی علی حسن خان نے اصل خطوط سے نقل کر کے مخطوطہ تیار کرتے ہوئے خط شکست کا استعمال کیا ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ ''موڈہ'' تحریر کرتے ہوئے ''ڈ'' پر ''ط'' نہیں لکھا ہوگا۔ نامہ ہائے فارسی غالب مطبوعہ 1969 میں شامل مخطوطے کی نقل میں بھی ''مودہ'' درج ہے۔ لیکن سید اکبر علی ترمذی نے مقدمے میں صفحہ xxii (22) پر مودہ کو ''مودہا'' تحریر کیا ہے اور فٹ نوٹ میں مودہا کا تذکرہ درج کیا ہے جس کی بنا پر سبھی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

(ر) مرزا یہ سفر بیل گاڑی سے کر رہے تھے۔ انھیں راستوں کا قطعی علم نہیں تھا۔ یہ کام گاڑی بانوں کا تھا کہ وہ کس آسان ترین راستے سے باندہ سے چلّہ تارہ تک پہنچیں۔ اس لئے انھوں نے اسی سڑک کا استعمال کیا اور موڈہ پر پڑاؤ کیا تھا۔ راقم الحروف کے پاس

کلیات نثر غالب (مشمولہ پنج آہنگ) مطبوعہ 1874 نولکشور، کانپور کے متعلقہ صفحات موجود ہیں جن میں صفحہ 164 پر صاف صاف ''موڈہ'' درج ہے۔ اس سلسلے میں نامہ ہائے فارسی غالب مطبوعہ 1969 کے اردو زبان میں مترجم پرتو روہیلہ نے اپنی کتاب نامہ ہائے فارسی غالب مطبوعہ 1999 میں حالانکہ خط نمبر 2/2 اور 3/3 میں ترجمہ کرتے ہوئے مودہ ہی تحریر کیا ہے۔ لیکن اس میں شامل اپنے ضمیمہ نمبر 2 میں یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ پنج آہنگ کا نسخہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی اور زیر نظر مجموعے پنج آہنگ میں ''مودہ'' کی جگہ موڈہ درج ہے (صفحہ 199)۔ اس کے علاوہ پاکستان کے مقتدر رسالے ''نقوش'' لاہور کے شمارہ نمبر 111، 1969 غالب نمبر میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا مضمون ''غالب کا ایک تاریخی سفر (دہلی سے کلکتہ تک)'' صفحہ 817 میں وہ تحریر کرتے ہیں:

> ''باندہ میں چھ ماہ قیام کے بعد غالب یہاں سے روانہ ہو کر موڈہ پہنچے۔ یہاں دو روز رکے۔۔۔۔ موڈہ سے چلّہ تارہ کا فاصلہ 12 کوس کا ہے۔ غالب نے دو روز میں طے کیا۔''
>
> (بحوالہ ذکر غالب، مالک رام، صفحہ 67 اور غالب از مہر، صفحہ 98)

ظاہر ہے کہ شیخ صاحب نے چھان پھٹک کر ہی تحریر کیا ہوگا۔ مخطوطے میں درج ''مودہ'' حرف آخر نہیں ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہ ہو۔ لیکن مودہ سے مودہا کیسے ہوگیا یہ ہمارے اہل تحقیق ہی بتا سکتے ہیں۔

(2) اب اس اعتراض کے سلسلے میں کہ 1874 کے نقشوں سے مرزا کے 1827 کے اس سڑک پر سفر کو کیسے درست تصور کیا جاسکتا ہے۔ کیا ضرور ہے کہ 1827 میں سڑک موجود ہو؟ اس سلسلے میں کچھ تاریخی حوالے یہاں پیش کرنا ضروری ہوگا کیونکہ ان کو نگاہ میں رکھے بغیر اس وقت کی صورت حال کا صحیح تصور نہیں کیا جاسکتا۔ صرف یہ اعتراض کہ

سڑک تھی یا نہیں محض قیاس آرائی پر مبنی ہوگا حالانکہ موصوف نے اس اعتراض کے جواز میں مرزا کے دہلی سے رام پور کے سفر کا حوالہ دیا ہے لیکن باندہ اور چلّہ تارہ کی صورت حال دیگر تھی۔

(الف) نواب علی بہادر اول والئی باندہ کا انتقال 1802 میں ہوا تھا۔ ان کی پہلی بیگم جن کا تعلق مراٹھاواڑ سے تھا۔ ان سے پیدا صاحبزادے شمشیر بہادر دوئم نے پونا سے آن کر باندہ کی گدی سنبھالی تھی۔ لیکن اسی درمیان پونا سرکار نے انگریز کمپنی بہادر کو ایک معاہدے کے تحت بندیلکھنڈ کا علاقہ ان کو سونپ دیا تھا۔ باندہ کی فوجی اہمیت کی بنا پر انگریز کوشاں تھے کہ اس پر قبضہ کیا جائے۔ اس لئے انھوں نے اس پر فوج کشی کردی تھی۔

شمشیر بہادر ثانی اس کے لئے تیار نہ تھے۔ اس لئے دو چار جھڑپوں کے بعد وہ بھاگ کر جالون کے مراٹھا صوبے دار کے پاس پہنچے اور مدد کے طلب گار ہوئے۔ اس نے ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور انھیں مشورہ دیا کہ کانپور کی انگریز چھاونی جا کر مصالحت کرلیں۔ اپنے وکیل کے ذریعہ شمشیر بہادر ثانی نے رابطہ قائم کیا تو معاملات طے ہوگئے اور شمشیر بہادر ثانی کو نوابی کے خطاب، محلات، شہر میں موجود ذاتی جائیداد اور جاگیر کے علاوہ چار لاکھ روپیہ سالانہ پنشن منظور ہوئی۔ 12/ جنوری 1804 میں سر جان بیلی ایجنٹ، گورنر جنرل نے ایک مراسلہ اور اقرار نامہ پیش کیا۔ جس کو شمشیر بہادر ثانی نے خود کانپور جا کر 16/ جنوری 1804 میں منظور کرتے ہوئے دستخط کردیے۔

(یہ اقرار نامہ عہد نامہ جات، مرتبہ بابو کنھیا لعل مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنو میں صفحہ 18 پر نمبر 28، مورخہ 15/ جنوری 1804 میں درج ہے)

1. Statistical & Discriptive Account of the North-Western Provinces, Vol. I, (Bundelkhand) Edwin T. Atkenson, 1874

(ب) اس طرح باندہ پر انگریزوں کا 1804 میں مکمل اقتدار قائم ہو گیا تھا۔ اب انھیں یہاں اپنی حفاظت کی خاطر ضروری ہو گیا تھا کہ وہ کانپور کی انگریز فوجی چھاؤنی سے رابطے میں رہیں اور وقتِ ضرورت وہاں سے افواج کی آمدورفت آسان ہو۔ اسی خاطر باندہ سے چلّہ تارہ تک کچی سڑک کو پختہ کرنے کے اقدام کیے گیے تھے۔

مرزا کا سفر 1827 میں ہو رہا تھا اس لئے 1804 سے 1827 تک تقریباً 23 سال کا وقفہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عرصے میں انگریزوں نے سب سے اہم کام یہی کیا ہوگا اور اس کو ہر موسم میں بہ آسانی استعمال میں لانے کے لئے انتظامات کیے ہوں گے۔ جیسے چلّہ تارہ گھاٹ پر ناؤ کا پل اور برسات کے موسم میں دریا پار کرنے کی خاطر ناؤں کے پختہ انتظامات وغیرہ تاکہ جمنا ندی کو پار کر کے گرانڈ ٹرنک روڈ تک سیدھا رابطہ قائم رکھا جا سکے۔ تاریخ کے سیاق و سباق میں اب یہ شک و شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ یہ سڑک 1827 میں نہیں تھی یا پکی سڑک نہیں تھی۔

دراصل تمام جغرافیائی و تاریخی حقائق سامنے رکھ کر ہی یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ ماضی میں کیا صورتِ حال رہی ہوگی۔ اور راقم الحروف کا خیال ہے کہ جب ان جغرافیائی اور تاریخی حقائق سے چشم پوشی کی جاتی ہے تو ایسی ہی گمراہ کن تحقیق ہوتی ہے۔

(ج) موصوف کا ارشاد ہے کہ مرزا نے ''مودہ'' سے چلّہ تارہ کا فاصلہ 12 کوس یعنی اٹھارہ میل بتایا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں سید اکبر علی ترمذی کے انگریزی مقدمے {نامہ ہائے فارسی غالب، مطبوعہ 1969، صفحہ xxii (22)} میں تحریر کیا ہے کہ (اردو ترجمہ):

> ''ایک رات راستے میں ایک گاؤں میں بسر کرنی پڑی۔ دوسرے دن صبح
> سویرے غالب گھوڑے پر سوار ہوئے اور دوپہر تک چلّہ تارہ کی سرائے

پہنچ گئے۔''

اب سوال یہ ہے کہ موڈہ سے چل کر ایک رات مرزا نے کس گاؤں میں بسر کی تھی؟ اگر یہ مانا جائے کہ وہ صبح سویرے تقریباً 7 بجے گھوڑے پر سوار ہو کر چلے اور دوپہر کو 11-12 بجے چلّہ تارہ کی سرائے پہنچے تو انھوں نے تقریباً 4-5 گھنٹے سفر کیا تھا اور تقریباً 10 میل کا راستہ طے کیا ہوگا۔ بیل گاڑی جو شام یعنی رات کو پہلے پہر میں سرائے پہنچی تھی یقیناً سویرے اور شام چل کر یہ فاصلہ بالترتیب صبح 5 میل اور شام 5 میل طے کر کے پہنچی ہوگی۔ اس طرح یہ مقام اتراہٹ ہی ہوگا جہاں مرزا نے رات بسر کی تھی۔

(د) اگر بقول مرزا موڈہ سے چلّہ تارہ کا فاصلہ 12 کوس یعنی اٹھارہ میل سمجھا جائے تو اس طرح موڈہ سے 18 میل چلّہ تارہ اور باندہ سے موڈہ تک کا فاصلہ تقریباً 7 میل جوڑ کر باندہ سے چلّہ تارہ کا فاصلہ 25 میل قرار پاتا ہے۔ اب اگر 25 میل کو کوس میں تبدیل کیا جائے (2 میل برابر ایک کوس) تو یہ فاصلہ تقریباً 12 کوس ایک میل ہوتا ہے۔ یہ بات طے ہے کہ مرزا نے فاصلے سے متعلق گاڑی بانوں ہی سے دریافت کیا ہوگا اور انھوں نے باندہ سے چلّہ تارہ کا مجموعی فاصلہ 12 کوس بتایا ہوگا جس کو مرزا نے غلطی سے ''موڈہ'' سے فاصلہ بتادیا ہے۔ دراصل یہ فاصلہ باندہ سے چلّہ تارہ تک کا ہے۔ اس طرح مرزا موڈہ سے چل کر ایک رات جس گاؤں میں ٹھہرے وہ اتراہٹ ہی رہا ہوگا۔

راقم الحروف کو اب یقین ہے کہ مرزا کے سفر کلکتہ کے درمیان باندہ آئے اور پھر وہاں سے کلکتہ کی خاطر چلتے ہوئے باندہ سے چلّہ تارہ کے درمیان واقع ''موڈہ'' کا عقدہ حل ہوگیا ہے جس کو مختلف محققینِ غالب نے کبھی موڈہ، کبھی مودہ اور کبھی مودہا بنادیا تھا اور یہ غلطیاں زمینی حقائق کو نظرانداز کرنے کی بناپر ہوتی تھیں جواب درست ہوجائیں گی۔

(محترم جناب حنیف نقوی صاحب کے خط کی نقل)

مکرمی ومحترمی!

آپ کا نوازش مراسلہ بذریعہ اسپیڈ پوسٹ کل 5/ جولائی کو موصول ہوا۔ زمینی حقائق سے متعلق آپ نے جو معلومات پیش فرمائی ہے، اس کے پیش نظر یہ طے ہے کہ غالب باندہ سے فتح پور جاتے ہوئے مودہا ضلع ہمیر پور سے نہیں گزرے تھے لیکن میں آپ کی اس رائے سے بھی متفق نہیں کہ ''مودہ'' دراصل ''موڑھ'' ہے۔ آپ نے 1874 کے نقشے پر انحصار کیا ہے اور غالب نے 1827 میں اس علاقے میں سفر کیا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ اس وقت وہاں باندہ سے چلّہ تارا تک پکّی سڑک موجود ہو۔ دہلی سے رام پور کے سفر میں غالب جن راستوں سے گزرے، ان میں سے کئی مقامات اب اس راستے میں نہیں آتے، نہ ٹرین کے سفر میں، نہ بس کے سفر میں اور نہ بیل گاڑی کے سفر میں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ وہ باندہ سے مودہا گانو ہوتے ہوئے ہی چلّہ تارا گئے ہوں گے۔ غالب نے مودہ لکھا ہے اس لئے زیادہ قیاس آرائی مناسب نہیں۔ البتہ اس گانو کے نام کا موجودہ املا، تلفظ اور باندہ سے فاصلے متعین کر دیجیے۔ مودہ نام کے گانو کی موجودگی میں ادھر ادھر بھٹکنا اصولِ تحقیق کے خلاف ہے۔

''بسیچ'' کے سلسلے میں بھی قیاس آرائی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ غالب نے یہ لفظ ارادے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس کی دو مثالیں میں پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں۔ ''نامہ ہائے فارسی غالب'' ہی میں صفحہ 89 پر اس کے بطور ۔۔۔۔۔ استعمال کی مثال بھی موجود ہے۔ ''با خود بسیچیدہ ام ۔۔۔۔'' نقطوں کے فرق پر نہ جائیے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ''بسیچ راہِ فتح پور کردہ خواہش شد'' میں پہلا لفظ ''بسیچ'' ہی ہے۔ اگر

یہ لفظ ''بہ سیج'' ہوتا تو اس کے لئے ''راہ'' کی بجائے ''سفر'' کا لفظ آتا لیکن اس صورت میں بھی یہ بامحاورہ زبان نہ ہوتی۔

غالب نے ''مودہ'' سے چلہ تارا کا فاصلہ بارہ کوس یعنی اٹھارہ میل بتایا ہے (ص 17)۔آپ کا کیا مشاہدہ ہے؟

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

احقر

حنیف نقوی

Statistical & Descriptive Accounts of the North Western Provices (Bundelkhand printed 1874, Edwin T. Atkenson, Surgey Benal)

The only instance of large market which has recently sprung up upon a principal routes of traffic is Rajapur. This town is situated on the road from Kamasin to Chhibun and Bargarh, and is also connected by a road with Manikpur, which, as above stated, is the chief railway station in the district. There are probably no markets requiring new roads, except perhaps Gungauli and Tindwari in Parganah Pailani; but all the roads in the district except the road from chilla to Banda, stand in great need of improvement.

The following is a table of distances from Banda of all places having 2,000 inhabitants, or which from any particular reason will find a place in the statistical account of the district :-

Place	Miles	Places	Miles
Atarra Buzurg	18	Khaptiha	8
Atrahat	14	Lugtara	9
Bhurendi	1	Mataundh	12
Bisanda Buzurg	18	Mahokhar	4
Bilgaon	10	Mawai Buzurg	4
Badausa	24	Marka	36
Baberu	20	Mau	34
Benda	22	Murwai	12
Dudhwa Manpur	37	Mungus	13
Garariya	22	Narayani	20
Gureh	3	Nayagaon	40
Girwan	10	Oran	26
Gukhiya	14	Pirdaran	30
Gurha Kalan	26	Pipehri	16
Hardauli	18	Paprainda	10
Ingua	34	Pathnehi	8
Jamalpur	6	Pailani	20
Jaspura	17	Rajapur	54
Khandeh	13	Rasan	29
Kalinjar	33	Silonda	11
Kartal	33	Sarha	30
Kurahi	20	Sinauni	18
Kairi	8	Sindhan Kalan	21
Karwi	42	Tindwari	14

The climate of the low land of Banda differs in some important respects from that of the Duab. The cold is less intense in the cold seasons, frost being rare except in the moist land adjoining the rivers. The hot weather commences in the middle of March in the spring crops (wheat, &c.,) are consequently ready for the sickle early in February, and very little is left uncut by the beginning of April. The hot winds are distinguished by two peculiarities - first, the absence or extreme rareness of dust-storms; secondly, the exceeding purity and transparency of the atmosphere during a greater part of that season, especially in the afternoons, when in other parts of India the sky has a hazy appearance from quantities of dust and fog in the air. This peculiarity is perhaps due to the constant exhalation of moisture proceeding from the ever-deepening fissures of the black soil. To this purity of atmosphere may perhaps be attributed the frequently fatal effects of the hot winds, or rather of the sun, deaths being not unfrequent among the natives from exposure at mid-day. In the commencement of the hot weather, when the nights are still cold and the sun is powerful from the moments of its appearance, the optical phenomenon of the elevation of distant scenery is not uncommon, either so as to elongate the groves and trees naturally visible or so as to bring objects far beyond the natural field of view.

*****

شہناز پروین

عہد حاضر کے ایران میں غالب کی شناخت

میرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی ہندوستان کے ادبی وشعری افق پر نورانی ستارہ کے مانند چمکے۔ غالب نہ صرف اردو زبان کے معروف و نامور شاعر اور ادیب ہیں بلکہ فارسی زبان میں بھی معرکے کے شاعر ہیں۔ ان کے عہد کے اردو اور فارسی زبان کے شعرا اور نثر نگاروں میں مشکل ہی سے ان کے پایہ کا کوئی نظر آتا ہے۔ غالب کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا یہ بات ان کے اس شعر سے واضح ہوتی ہے۔

فارسی بین تا ببینی نقش ہای رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بی رنگ من است

غالب نے فارسی زبان میں قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے لیکن افسوس اس کے باوجود ایران میں غالب کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔ ایران میں غالب پر جو مضامین لکھے گئے وہ بہت کم ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ برصغیر کے فارسی گو شعرا جن کی شناخت ایران میں کم کی گئی ہے غالب ان میں سے ایک ہیں۔ لیکن کچھ ہندوستانی شعرا جیسے امیر خسرو دہلوی، بیدل، فیضی، داراشکوہ، غنی کشمیری، زیب النساء، مخفی اور علامہ اقبال سے متعلق ایران میں خاصا کام ہو چکا ہے۔

غالبؔ نے اپنے خطوط اور اپنے اشعار میں ایران کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایران کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ البتہ ایران میں عصر حاضر میں غالبؔ پر جو تحقیقی کام ہوا ہے اور جو مقالات لکھے گئے ہیں باوجود کم ہونے کے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

تہران یونیورسٹی میں 1961ء میں جناب سید غلام اکبر نقوی کی فارسی ادبیات میں پی ایچ ڈی کے مقالہ کا عنوان ''کلیات نظم فارسی اسداللہ خان غالبؔ دہلوی'' تھا۔ یہ مقالہ ٹائپ شدہ 148 صفحات پر مشتمل ہے جو انھوں نے استاد حسن خطیبی کی رہنمائی میں مکمل کیا۔ یہ غالب دہلوی پر ایران میں پہلی تحقیق شمار کی جاتی ہے۔ اس کا پہلا حصہ چار ابواب پر مشتمل ہے اور حصہ دوم میں سبک شعر غالبؔ، صنایع شعری، حسن تعلیل، لف و نشر، تنقیس الصفات، ترصیع، تضاد، مراعات النظیر، تضمین، ارسال المثل، سوال و جواب شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کلام غالبؔ میں مبالغہ، شوخی و طنز، خود ستائی و تفاخر، اصل و نسب نیز غالبؔ کے کلام میں قرآن کا تاثر، شعرای ایران و سخنان غالب پر بحث کی گئی ہے۔

نقوی صاحب کے تقریباً بیس سال بعد ڈاکٹر محمد حسن حائری نے 1979 میں تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹر اسماعیل حاکمی نے استاد دانشگاہ تہران کی نگرانی میں ''نقد و بررسی غزلیات فارسی میرزا اسداللہ خاں غالبؔ دہلوی'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا جو 135 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ''میخانۂ آرزو'' کے نام سے غالبؔ پر ایک کتاب ترتیب دی گئی جو 1993 میں تہران سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر حائری ہی نے دیوان غالبؔ کی تصحیح و تحقیق کا کام کیا جو 1998 میں وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی انتشار

سے شائع ہوا۔ یہ دیوان غالبؔ کی غزلیات، رباعیات، مثنویات و قصاید پر مشتمل ہے۔مقدمہ میں غالبؔ کے فارسی و اردو واحوال و آثار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فارسی میں کلیات نظم فارسی، میخانۂ آرزو، سبد چین، سبد باغ دودر، دعاء الصباح، رسالہ فن بانگ اور اردو نثر میں پنج آہنگ، مہر نیمروز، دستنبو، قاطع برہان، درفش کاویانی، مآثر غالبؔ، متفرقات غالبؔ، دیوان اردو، قادرنامہ و بیاض، عود ہندی، اردوئے معلّٰی، نادرات غالبؔ، مکاتیب غالبؔ، نکات ورقعات غالبؔ، نادر خطوط غالبؔ کا نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔اس کے بعد غالبؔ کے قصیدے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالبؔ کے قصیدے بھی اہمیت کے حامل ہیں نیز غالبؔ کی عاشقانہ اور فلسفیانہ شاعری کا بھی ذکر کیا ہے۔انھوں نے غالبؔ کے 334 اشعار کو پانچ مختلف نسخوں سے جو کہ دہلی، نولکشور، ترقی ادب لاہور (جلد سوم) اور لکھنؤ سے شائع ہوئے ہیں مقابلہ و مقایسہ کیا ہے۔

غالبؔ دہلوی سے متعلق ایک ایرانی دانشمند محمد علی فرجاد نے ''احوال و آثار میرزا اسداللہ خاں غالبؔ'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو 1944 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب 257 صفحات پر مبنی ہے۔حصہ اوّل میں ''اوضاع واحوال مملکت ہند و کیفیت زبان فارسی'' پر تحقیق کی ہے اور حصہ دوم ''شرح حال میرزا غالبؔ'' پر مشتمل ہے۔اس میں غالبؔ کے اشعار بھی بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔

ڈاکٹر علی اصغر حکمت کی کتاب ''نقش پارسی براحجار ہند'' کتاب فروشی ابن سینا تہران سے شائع ہوئی۔اس کتاب کا موضوع وہ فارسی کتبے ہیں جو کہ ہندوستان کی قدیم تاریخی عمارتوں پر درج ہیں۔نقش پارسی احجاز ہند۔(صفحہ 126)

میں غالبؔ کے مزار کے بارے میں چند سطریں لکھی ہیں اور صفحہ 128 پر غالبؔ کے مقبرہ کی تصویر بھی دی گئی ہے یہ کتاب 57-1956 میں رسالہ انڈو ایرانیکا، کلکتہ سے سلسلہ وار چار حصوں میں شائع ہو چکی ہے۔

تہران سے 1958 میں ان ہی کی دوسری کتاب ''سرزمین ہند'' شائع ہوئی یہ کتاب زمانہ قدیم سے عصر حاضر کے ہندوستان کی تاریخی، سماجی اور سیاسی حالات پر مبنی ہے اس میں غالبؔ کا ذکر (صفحہ 358) دوسرے شعرا کے نام کے ساتھ موجود ہے۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی کتاب ''گنج سخن (صفحہ 230)'' میں غالبؔ کے بارے میں چند سطریں موجود ہیں۔ اس کے بعد صفحہ 233 پر منتخب اشعار لکھے ہیں۔

ڈاکٹر محمد معین کی ''فرہنگ معین'' انتشارات امیر کبیر کی جانب سے 1974 میں شائع ہوئی اس کی جلد پنجم (صفحہ 1238) میں غالبؔ کا ذکر موجود ہے۔

علامہ بزرگ تہرانی کی عربی زبان میں ''الشعر و الشعراء من الذریعہ الی التصانیف الشیعہ'' 1964 میں تہران یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔ غالبؔ کے دیوان کے تحت دیگر تالیفات کا مختصر ذکر ہے۔ ڈاکٹر زہرا خانلری (کیا) کی کتاب فرہنگ ادبیات فارسی 70-1969 میں انتشارات بنیاد فرہنگ ایران سے شایع ہوئی۔ اس میں حرف ''غ'' کے تحت پہلا نام غالبؔ کا آیا ہے۔ ان کے بارے میں ایک مضمون درج ہے۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ دیگر ایرانی نقادوں اور دانشمندوں نے بھی غالبؔ سے متعلق مختلف موضوعات پر مقالے لکھے جو ایران سے شائع ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ایرانی ثقافتی مشیر جناب مصطفیٰ طباطبائی 1993-1995 ''رسالہ مہر'' میں ''اسد اللہ خاں

غالبؔ'' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا جس کا آغاز غالبؔ کے اس شعر سے کیا ہے:

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت

می توان گفت، این بندہ خداوند نداشت

اس کے بعد ایران کے معاصر شاعر، نقاد اور تہران یونیورسٹی کے پروفیسر جناب شفیعی کدکنی نے رسالہ ''ہنر و مردم'' 1968 کے شمارہ میں ''شعر پارسی در آنسوی مرزہا'' کے عنوان سے اپنے سلسلہ وار مقالہ میں (صفحہ 29-24) غالبؔ کی شاعرانہ عظمت پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے یہ مقالہ غالبؔ کی وفات کے سو سال پورے ہونے کے موقع پر لکھا تھا۔

ڈاکٹر شفیعی کدکنی نے جب ہندوپاک میں غالبؔ کی سوویں برسی منائی جارہی تھی تو اس وقت بھی مجلّہ سخن 1969 شمارہ 11-12 میں (صفحہ 1175-1173) ایک بار پھر غالبؔ پر مقالہ لکھا اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ فارسی کا اتنا عظیم شاعر اور ایران میں اس کی شناخت تشنہ طلب ہے۔

لاہور میں غالبؔ پر منعقدہ بین الاقوامی سیمنار میں ایرج افشار نے جو مقالہ پڑھا تھا وہ مجلّہ راہنمائی کتاب سال چہارم شمارہ 3-2-1/ 1971 میں شائع ہوا۔ شہید بہشتی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر (ضیاء الدین) سجادی کا مقالہ ''بحثی دربارۂ شعر غالب دہلوی'' کے عنوان سے رسالہ ''پیوند دوستی'' شمارہ اوّل، اسفند 1977 میں شائع ہوا۔ مشہد یونیورسٹی کے استاد ادبیات فارسی ڈاکٹر علوی مقدم نے ''سیری در اندیشہ ہای غالب دہلوی'' کے عنوان سے مشہد کے مجلّہ دانش کدہ ادبیات وعلوم انسانی کے شمارہ چہارم، سال بیست ویکم زمستان 1988 میں ایک مفصل مقالہ فارسی زبان میں شایع کیا۔ ڈاکٹر علوی مقدم کا یہی مقالہ مجلّہ دانش، اسلام آباد میں ''غالب کیست''؟ نیز مجلّہ بیاض، دہلی سال دھم

شمارہ 1990 میں بہ عنوان ''زبان فارسی و عرفان در سرزمین ہند (صفحہ 80-96)
میں کچھ ترمیم کے بعد شائع ہوا۔

1701 میں ہندوستان میں ایک فرہنگ ''برہان قاطع'' کے نام سے لکھی گئی
جس کے مؤلف محمد بن حسین بن خلق تبریزی ہیں۔ اس سے پہلے ایک فرہنگ جمال الدین
حسین انجوی شیرازی نے فرہنگ جہانگیری کے نام سے 1638 میں لکھی۔ اس وقت
دراصل کسی زرتشتی کے پاس سے ایک کتاب کے چند اوراق ملنے سے وہ گمراہی میں مبتلا
ہوئے۔ انھوں نے اس کتاب کے الفاظ کو فارسی سے مشابہ تو بتایا لیکن چونکہ کامل یقین نہ تھا
اس لیے اس کو ایک الگ جلد میں شائع کیا۔ لیکن برہان قاطع کے مؤلف نے ان کو فارسی
کے اصیل لفظ شمار کرتے ہوئے سیکڑوں دساتیری الفاظ کو فارسی کے شانہ بہ شانہ کھڑا کر دیا
اور اپنی لغت میں الفبائی ترتیب سے شامل کیا۔ اس سے متعلق بہت سی بحثیں چھڑیں۔
خان آرزو نے برھان قاطع کی اغلاط کی وجہ سے 1147 میں ایک لغت سراج اللغت لکھی
اس کے بعد غالبؔ نے بھی اس بحث کو آگے بڑھایا اور کتاب قاطع برہان لکھی۔ ڈاکٹر معین
نے برہان قاطع کی تصحیح و تحقیق کا کام انجام دیا جو 1963 میں تہران سے شائع ہوئی۔ اس
میں ڈاکٹر معین نے ایک مفصل مقدمہ لکھا اور ابراہیم پور داؤد استاد دانشگاہ تہران نے
دساتیر پر مفصل بحث کی ہے۔

غالب نے قاطع برہان لکھنے کی غرض و غایت بتائی کہ چونکہ ان کی نظر میں
برھان قاطع نادرست تھا اور لوگوں کو گمراہ کرنے والا تھا اس لیے انھوں نے غلط اور صحیح
طرف ترجمانی کی غرض سے یہ کتاب لکھی۔

ڈاکٹر معین نے دساتیری الفاظ کو آذر کیوان کے پیراوان کا خودساختہ معاملہ بتایا

جس نے برہان قطع سے لے کر بعد تک جگہ پائی۔ انھوں نے دساتیری الفاظ کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کو ''از برساختہ ہای دساتیر'' بتایا ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ہر سال غالب اور اس سے متعلق مختلف موضوعات پر بین الاقوامی سیمنار منعقد کراتا ہے جس میں بارہا ایرانی دانشمندوں کی شرکت بھی ہوتی رہی ہے وہ مختلف موضوعات پر اپنے بیش بہا مقالے پیش کرتے رہے ہیں۔ جو غالب ناموں کے مختلف شماروں میں شائع ہو چکے ہیں ن کی تفصیل اس طرح ہے۔

1969 میں غالب صدی ہفتہ کا انعقاد ہوا اور ایک بین الاقوامی سیمنار منعقد ہوا۔ جس میں ہندوستان کے علاوہ غیر ملکی اسکالروں نے بھی شرکت کی۔ ایران سے پروفیسر لطف علی صورتگر نے شرکت کی۔ ان کا شمار ایران کے معروف نثر نگاروں، ناقدین اور شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''نکتہ ای چند دربارہ اشعار اسد اللہ خاں غالب''، جس میں غالب کی شعری صلاحیت، ان کے ابتکار معنی، ان کے فصیح وشیوا بیانی اور ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ نیز غالب کے فارسی کلام کو ایرانی شعر وادب کے درخت بارآور کی شاخ قرار دیا ہے۔ ایرانیوں کو ان کے شعر کا شیفتہ اور غالب کو ایرانی شعرا کا ہم خانوادہ بتایا ہے۔ اس مقالہ میں ڈاکٹر صورتگر نے شروع سے آخر تک غالب کی عظمت، ان کی قادر کلامی اور مہارت شعر گوئی کا بار بار ذکر کیا ہے اور غالب کو ''سخن سرای زبردست ہندوستان'' کا خطاب دیا ہے۔

غالب نامہ جنوری 1984 میں پروفیسر محمد استعلامی کا مقالہ بہ عنوان ''صحو وسکر درغزل غالب'' شائع ہوا اس میں انھوں نے ''غالب کی غزل صحو سکر'' سے متعلق نہایت مختصر تمہید باندھی ہے۔ صحو کا مطلب ان کی نظر میں ہوش اور ہوشیاری ہے اور یہ بھی بتایا ہے

کہ تصوف کی اصطلاح میں صحو سے انسان اپنے اعمال واحوال کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ سکر کا مطلب ہے شوق ووارفتگی جو انسان خدا کے حضور میں محسوس کرے۔ اس کیفیت کی وجہ سے راہ حق کے سالک کو ہوش نہیں رہتا بلکہ اس پر ایک اضطراب اور ہیجان کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ شریعت کے آداب اور احکام کی طرف سے لاپروا ہو جاتا ہے اور ایک طرح کی شان بے نیازی سے گفتگو کرتا ہے۔ ساتھ ہی مثال میں غالبؔ کے اشعار پیش کیے ہیں۔

غالبؔ نامہ جولائی 1993 کے شمارہ میں ڈاکٹر رضا مصطفوی یونیورسٹی علامہ طباطبائی تہران کا مقالہ فارسی زبان ہی میں ''برشگال ہند و برشگال غالبؔ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ مقالے میں برشگال کے معنی اور غالبؔ کے وہ اشعار جو برشگال سے متعلق ہیں تحریر کیے ہیں۔ برشگال سنسکرت کا اصل لفظ بتایا جاتا ہے اور اس لفظ نے ورشا کال (vershakal) کی صورت لی۔ اس کے جز ہیں ''ورشا'' یعنی بارش اور کال یعنی ''موسم'' اور یہ معادل ہے برسات کا۔ برسات، ورشا، برشا، برکا، برس، لفظ ورشا کال کو برصغیر کے فارسی گوشعرا نے استعمال کیا ہے اور آگے لکھتے ہیں کہ (واو) حرف (ب) میں تبدیل ہو گیا۔ ہندی اور فارسی زبان میں ''برشگال'' یا ''برشکال'' کا رواج ہوا۔ برشگال ہندوستانی تیسرا موسم ہے جو کہ گرمی کے بعد آتا ہے یعنی برسات کا موسم۔ غالبؔ کے اشعار کے ساتھ دوسرے شعرا کے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ غالب نے برشگال کی تعریف اپنے اشعار میں اس طرح کی ہے:

برشگال و تموز اند رہند دیدہ باشی کہ بر چہ منوال است
ھریکی را زین دو فعل بہ وصل دوش بردوش، بال بربال است

فیض باران ہم از بہاران جوی کاروانی ،دگر بہ دنبال است

ڈاکٹر رضا مصطفوی کا ایک اور مقالہ ''سہم غالب در گسترش واژہ ھای فارسی درشبہ قارہ ہند'' فارسی زبان ہی میں غالب نامہ جنوری 1994 میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر علوی مقدم کا مقالہ'' غالب کون ہے؟'' کے عنوان سے غالب نامہ جنوری 1996 میں شائع ہوا۔اس میں غالب کے احوال وآ ثار کا ذکر ہے۔غالب کے درج ذیل شعر کا خلاصہ بھی کیا ہے۔

فارسی بین تا ببینی نقشھای رنگ رنگ

بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است [1]

فارسی بین باتہ بینی کا ندر اقلیم خیال

مانی وراژنگم و آن نسخہ ارتنگ من است

[1]۔ بیرنگ: ایسا صفحہ جس کو نقاش رنگوں کو پرکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

لوگ اس شعر کا مطلب اکثر غلط نکالتے ہیں۔یعنی غالب کی اردو شاعری فارسی شاعری کے مقابلے میں بے رنگ بتاتے ہیں جبکہ انھوں نے اس شعر کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ:

''غالب مندرجہ بالا قطعات میں اپنی فارسی گوئی پر فخر کرتا ہے اور اپنے آپ کو فارسی دانی اور فارسی سرائی میں ہنرمند سمجھتا ہے۔فارسی کو اپنی اصل زبان مانتا ہے اور اس بات پر اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ اپنے ہنر کی نمائش فارسی زبان میں بہتر طریقے سے کرسکتا

ہے۔ اردو زبان اس کے لیے ایک ایسے خاکے کی طرح ہے جس کو نقاش رنگ آزمانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔''

دانشمندوں کی نظر میں یہی صحیح بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں غالب کے خطوط کے انداز بیان پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ جناب اکبر ثبوت کا مقالہ فارسی زبان میں بہ عنوان ''غالبؔ و اندیشۂ وحدت وجود'' غالبؔ نامہ جنوری 1996 میں شائع ہوا۔ استاد حسین فقیہی کا مقالہ ''نقد و بررسی دیوان غالبؔ'' فارسی زبان میں غالبؔ نامہ جولائی 1999 میں شائع ہوا۔ اس مقالہ میں غالبؔ کے احوال درج ہیں۔ ان کی نظر میں غالبؔ کی شاعری میں ادبی زیبائش و آرئش میں شعری اصناف سخن، جناس، مراعات، کنایات نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی غالبؔ کے شعروں میں قرآنی تلمیحات کی نشاندہی بھی کی ہے۔

ھر جا کہ رفتہ معنی لا تقنطوا بہ کار
پیچید بوی سنبل فردوس درمشام

تلمیح آیت یہ بتائی ہے لا تقنطو من رحمتہ اللّٰہ۔ ان اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعاً۔

یحیی طالبیان کا مقالہ فارسی زبان میں بہ عنوان ''عناصر شعری ترکیب بندی از غالبؔ'' غالبؔ نامہ جنوری 2003 میں شائع ہوا۔ وہ مقالہ چھ حصوں پر مشتمل ہے (1) مقدمہ میں غالبؔ کی زندگی کا مختصر ذکر ہے (2) ساختار معنای ترکیب بند در محور عمودی (3) آزادگی غالب (4) انسجام محور عمودی (5) موسیقی اور آخر میں نتیجہ گیری درج ہے۔ اس ترکیب بندی سے واضح ہو جاتا ہے کہ غالب کی اصل سوچ عاشقانہ اور عارفانہ ہے۔ غالبؔ کی غزلوں میں موسیقی ترکیب بند تلمیح بند کا استعمال زیادہ ہے۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عہد حاضر کے ایران میں غالب کی شناخت آہستہ روی سے ہی سہی لیکن جاری ہے اور امید ہے کہ یہ سلسلہ آگے بھی جاری وساری رہے گا۔

منابع:

1۔ قند پارسی، فصل نامہ رایزی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو، شمارہ 9 بہار 13

2۔ دانش، فصلنامہ رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری ایران، لاہور، بہار و تابستان

3۔ میخانہ آرزو، دکتر محمد حسن حائری 1993

4۔ دیوان غالب دہلوی مشتمل بہ غزلیات و رباعیات فارسی، سرودہ : میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی۔

مقدمہ، تصحیح و تحقیق دکتر محمد حسن حائری چاپ اوّل

5۔ غالب پر چند مقالے، پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی دسمبر 1991

6۔ سہ ماہی مجلہ غالب نامہ، جنوری 1972

7۔ سہ ماہی مجلہ غالب نامہ، جنوری 1984

8۔ سہ ماہی مجلہ غالب نامہ، جولائی 1993

9۔ سہ ماہی مجلّہ غالب نامہ، جنوری 1994

10۔ سہ ماہی مجلّہ غالب نامہ، جنوری 1996

11۔ سہ ماہی مجلّہ غالب نامہ، جولائی 1999

12۔ بیاض مجلّہ تحقیقات فارسی، انجمن فارسی دہلی 1985

13۔ بیاض مجلّہ تحقیقات فارسی، انجمن فارسی دہلی، شمارہ 1-1990

*****

English Publications of Ghalib Academy

1. *Whispers of the Angel* (Nawa-e-Sarosh)
   Selection from Fourteen English Translation of Ghalib
   Price Rs. 40/-

2. *A Dance of Sparks*
   Imagery of Fire in Ghalib's Poetry
   by Prof. Annemarie Schimmel, Price Rs. 150/-

3. *Iqbal Essays and Studies*
   15 Articles of different scholars on Iqbal
   Edited by Prof. Asloob Ahmad Ansari, Price Rs. 95/-

آپ کی بات

''جہان غالب'' کا چوتھا شمارہ ملا۔ بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے ناچیز کو اس قیمتی شمارے سے سرفراز کیا۔ غالب کے حوالے سے جو مضامین بھی ''جہان غالب'' شمارہ 4 میں شامل کیے گئے ہیں وہ سب خواندنی ہیں اور معلومات میں اضافے کا باعث۔ آپ کی ادارتی صلاحیتوں کی داد دینی پڑتی ہے کہ آپ نے غالب کے سلسلے کے کتنے نئے پہلو دریافت کر کے مضامین شامل اشاعت کیے ہیں۔ امید ہے دیگر شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی اہل علم کے لئے قیمتی اور معلوماتی دستاویز ثابت ہوگا خاص کر غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے تو بڑی کارآمد چیز ہے۔

والسلام

سید حسن عباس

شعبہ فارسی

بنارس ہندو یونیورسٹی

''جہان غالب'' کا شمارہ نمبر 4 موصول ہوا۔ شکریہ۔ یوں تو میرے پاس دنیا جہان کے بے شمار ادبی رسائل و جرائد آتے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی کے بھی۔ لیکن آپ یقین جانیں کہ ''جہان غالب'' کے مشمولات کی سنجیدگی، گہرائی، گیرائی اور معیار کا جہاں تک معاملہ ہے تو آپ کا یہ جریدہ بے مثال ہے۔ میرا خیال تھا کہ غالب پر اب کچھ نیا نہیں ہوسکتا۔ مجھے اپنے مطالعہ پر جو گمان تھا وہ چکنا چور ہوگیا ہے۔ آپ اس قدر بلند معیار مضامین سے ہر شمارے کی ترتیب و تہذیب فرماتے ہیں کہ وہ بقول Brancis Bacon لفظوں کو چبا چبا کر ہضم کرنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔

نیاز مند

راشد جمال فاروقی

C-1452، آئی۔ڈی۔پی، ایل

ٹاؤن شپ، ویر بھدرا

رشی کیش، دہرادون

ارسال کردہ ''جہان غالب'' جلد دوم کا شمارہ 4 ملا۔ ممنوں ہوں کہ آپ نے اس شمارے کے ذریعہ غالب سے ہماری قربت کو مزید تقویت بخشی۔

''جہان غالب'' کو واقعی اسم بامسمیٰ پایا۔ نہ صرف یہ کہ معیاری اور عصری تقاضوں کے پیش نظر مقالات آپ نے شائع کیے بلکہ ''غالب اکیڈمی'' کی جملہ سرگرمیوں سے بھی روشناس کیا۔ جہاں غالب کے یوم ولادت و پیدائش، طرحی مشاعرہ، محفل کلام غالب اور

سیمینار کے علاوہ ماہانہ ادبی نشست اور تحریری مقابلوں کی روداد دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ اس ''جہان غالب'' کی سیر سے ہم بھی مسرور و محظوظ ہوئے۔

''کتابوں کی باتیں'' بغور پڑھا۔ اختصار کے باوجود آپ نے قارئین کو ''روح کتاب'' سے آشنا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آپ کا بے تکلفانہ انداز تبصرہ اچھا لگا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''شان اودھ'' کی اشاعت سے نہایت مسرت ہوئی۔ وسیم احمد سعید صاحب کی اس ''تاریخی اور ادبی کاوش'' کا احسان ہم ہندوستانیوں اور محبان اردو کے لئے ناقابل فراموش ہوگا۔

خیر اندیش

احمد سجاد
2- ک/3- بریاتو ہاؤسنگ کالونی
رانچی، جھارکھنڈ

*****
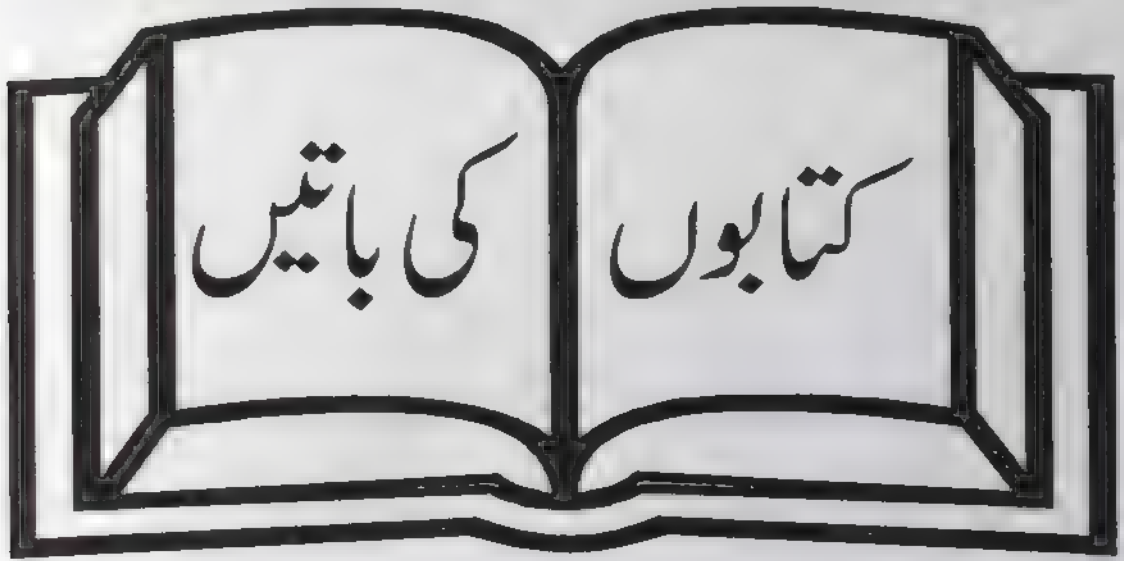
(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری)

کتاب کا نام	:	میرزا غالب کا روزنامچہ
تالیف	:	خواجہ حسن نظامی دہلوی
ناشر	:	غالب اکیڈمی، نئی دہلی
قیمت	:	50/- روپے
اشاعت	:	2007

شمس العلما مصور فطرت خواجہ حسن نظامی اگر چہ واقعات 1857 کے چشم دید گواہ نہ تھے لیکن ان کے زمانے میں خاندان شاہی کے ایسے افراد موجود تھے جو اس دور کی داستان بیان کرتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے ان لوگوں کی آپ بیتی سن کر اپنے مخصوص انداز میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں بیگمات کے آنسو، انگریزوں کی بپتا، محاصرۂ دہلی کے خطوط اور غدر دہلی کے اخبار وغیرہ شامل ہیں۔ اسی سلسلے کی ساتویں کڑی میرزا غالب کا

روز نامچہ ہے۔

خواجہ حسن نظامی اردو کے صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ انھوں نے قران کا آسان زبان میں ترجمہ کیا۔ اردو میں سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں جن میں ان کی انشا پردازی کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھیں شمس العلما کا خطاب ملا تھا۔ اردو والے انھیں مصورِ فطرت کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔

غالب نے کوئی روز نامچہ تحریر نہیں کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے غالب کے خطوط سے کچھ تحریریں اخذ کر کے روز نامچے کی شکل میں شائع کیا تھا جس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ 1857 کی 150 ویں سالگرہ کے موقع پر غالب اکیڈمی نے اسے پھر سے شائع کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> غالب کے روز نامچے میں ایک حرف بھی فرضی نہیں ہے بلکہ چشم دید اصلی حالات کی تصاویر ہیں اور پھر بیان ایسا صاف ستھرا اور اعلیٰ ہے کہ میری عبارت اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ غالب کے اس روز نامچے سے دہلی کی عمارتوں، دہلی کے نامور آدمیوں، دہلی کی قدیمی معاشرت، دہلی کے پرانے احساسات کا اتنا بڑا ذخیرہ حاصل ہوتا ہے جو کسی غدر دہلی کی تاریخ میں نہیں ملے گا۔

غالب اردو کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے 1857 کے واقعات کو دیکھا اور اس کے بہت بعد تک حیات رہے۔ غالب کے بیشتر معاصرین انگریزوں کے عتاب کے شکار ہوئے۔ غالب اپنے دوستوں میں تنہا تھے جنھوں نے اپنے آپ کو محفوظ رکھا 1857 کے واقعات کا ذکر ان کی نثری تحریروں میں ملتا ہے۔ خواجہ صاحب نے نہ صرف ان کو یکجا کیا

بلکہ ان پر اپنا نوٹ تحریر کیا۔ یہاں صرف ایک مثال سے غالب کی تحریر اور خواجہ صاحب کے نوٹ کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دہلی کے مفتی اعظم کی بے چارگی

"جناب مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط ناچار خستہ وتباہ لاہور گئے۔ فنانشیل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے۔ کس واسطے کہ ایک آپ اور بی بی، بتیس چالیس روپیہ کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش چپراسی اس کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں لہٰذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے آخر میں ہیں خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں۔"

غالب کی اس تحریر پر خواجہ صاحب نے جو نوٹ تحریر کیا ہے اس سے 1857 اور آج تک کی دلی میں ایک ربط پیدا ہوتا ہے۔

مفتی صدرالدین صاحب صدرالصدور دہلی کے اکابر علما شرفا میں تھے۔ حویلی صدرالصدور کا تختہ اب بھی میونسپل کمیٹی کی طرف سے لکھا ہوا ایک دیوار پر نظر آتا ہے اور جانے والے کو رلاتا ہے۔ مٹیا محل کے سامنے ان کا مکان تھا جس میں خاندان بہادر غلام محمد حسین خاں رجسٹرار مرحوم کی سکونت تھی اور اب ان کی اولاد رہتی ہے۔

اللہ اللہ مسلمانوں کی غربا پروری کس شان کی تھی کہ مٹنے اور مٹائے جانے کے بعد بھی جب کہ نوے برس کے قریب عمر تھی، اور صرف چالیس روپے مہینہ گزر اوقات کے

لیے باقی بچا تھا مگر اپنے چپراسی کے کنبہ کو پالتے تھے۔

حسن نظامی

1857 کے واقعات کے علاوہ اس کتاب سے مرزا غالب کے بعض کوائف کا بھی پتہ چلتا ہے جیسے غالب کا نسب نامہ، غالب کا حلیہ، غالب کی ازلی طبیعت، غالب کا مجموعہ کلام، غالب چشتی نظامی تھے وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی 1857 کے واقعات کے تعلق سے دہلی کی جو تباہی و بربادی ہوئی اس سے متعلق غالب کی جو تحریریں اخذ کی گئی ہیں ان کے کچھ عنوانات اس طرح سے ہیں:

''قلعہ کی تباہی کی پیش گوئی، اب دہلی میں کون رہتا ہے، اب دہلی میں ساہوکاروں کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ اینٹ سے اینٹ بجادی، فقیر اور ہتھیار نہ آئے، امام باڑے کا انہدام، دہلی کی چنگی کے پہلے ملازم، دلی پر پانچ لشکروں کا حملہ، غدر نہیں خدا کا قہر، اب کوئی دوست میرے سامنے نہ مرے، مٹنے والوں کے گھروں میں کون رہتا ہے، جامع مسجد کی رہائی، کشمیری کٹرہ کی مسماری، دہلی کے غارت شدہ بازار، دہلی میں مارشل لا، انگریزوں کے احسان کی یاد، دہلی کا دردناک مرثیہ، دہلی میں باغیوں کا اجتماع، باغیوں کا حشر'' وغیرہ۔ یہ ایسے عنوانات ہیں جن پر غور کئے بغیر 1857 کی بات ممکن نہیں۔ غالب اور 1857 سے متعلق قارئین اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب دلچسپ ہی نہیں سودمند بھی ہے۔

●●●

کتاب کا نام	:	اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب
مصنفہ	:	ڈاکٹر بیگم نیلوفر احمد
ناشر	:	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
قیمت	:	-/250روپے
سن اشاعت	:	2007

نثری اصناف میں خطوط نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور غالب کی خطوط نگاری کے ذکر کے بغیر اردو نثر کی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ غالب کی شاعری کے مقابلے نثر پر کام کم ہوا ہے۔ ڈاکٹر بیگم نیلوفر احمد نے "اردو میں ادبی خط نگاری کی روایت اور غالب" کے عنوان سے کتاب تصنیف کر کے ایک قابل قدر کام کیا ہے۔ اصل میں کتاب کے دو حصے ہیں ایک اردو میں ادبی خط نگاری، دو غالب کی خط نگاری دونوں کا مصنفہ نے حق ادا کیا ہے۔ پہلا حصہ تحقیقی ہے۔ اس میں انھوں نے خط نگاری کے فن، اس کی اہمیت، خط نگاری کی تاریخ جیسے عنوانات قائم کر کے اس موضوع پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کتاب میں اردو نثر کی تاریخ اور ارتقا پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے حصے میں مصنفہ نے غالب سے پہلے اور غالب کے بعد اردو خط نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ اور غالب کے خطوط کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے اور خاص طور پر لسانی پہلو پر زیادہ بحث کی ہے۔ ہر جگہ حوالے اور اقتباسات پیش کئے گئے ہیں اس سے مصنفہ کے وسیع مطالعے اور تحقیقی ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے۔ اردو نثر خصوصاً خط نگاری کے فن اور غالب کی نثر پر کام کرنے والے طلبا کے لیے یہ کتاب بہت اہم ثابت ہوگی۔

●●●

کتاب کا نام : غالب کی فارسی شاعری: تعارف وتنقید

مصنف : ڈاکٹر تنویر احمد علوی

ناشر : غالب اکیڈمی، نئی دہلی

قیمت : -/250 روپے

اشاعت : 2007

مرزا غالب اپنی فارسی شاعری کو زیادہ پسند کرتے تھے اور اردو شاعری کو بے رنگ کہا کرتے تھے۔ ان کے فارسی قطعے کے ایک شعر کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔ ''فارسی کو دیکھ تا کہ تو میری فکر شاعرانہ کے رنگا رنگ نقش دیکھ سکے اردو کے مجموعے سے گزر جا کہ وہ تو میرا ایک ''مجموعہ بے رنگ'' ہے۔ غالب کو بے شک اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر ناز تھا لیکن غالب کی مقبولیت کا اصل سبب ان کا مجموعۂ بے رنگ ہی ہے۔ اس پر کام ہو رہا ہے کتابیں چھپ رہی ہیں، تحقیق ہو رہی ہے، شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ ان کی فارسی شاعری کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے اب ایسے وقت میں جب فارسی کا چلن ہندوستان میں عام نہیں ہے غالب کی فارسی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے یقیناً ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس کے مطالعے سے غالب کی فارسی شاعری سے متعارف ہوا جا سکے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی کتاب غالب کی فارسی شاعری: تعارف وتنقید اس کمی کو بہت حد تک پورا کرتی ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی دورِ حاضر کے ایسے محقق ہیں جنھیں اردو اور فارسی پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان کی ایک کتاب ذوق کی سوانح اور شاعری پر ہے۔ خطوط غالب کی روشنی میں انھوں نے غالب کی سوانح بھی مرتب کی ہے۔ غالب کے فارسی خطوط کا ترجمہ

بھی کیا ہے۔ غالب کی فارسی شاعری: تعارف وتنقید ان کی تازہ ترین تصنیف ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی کتاب کے حرفِ سرِ آغاز میں لکھتے ہیں:

''میرے اس تعارف نامے کے ذریعے کم از کم اہل اردو کے علم میں اتنی بات آ جائے گی کہ اپنے قطعات اور قصائد میں غالب نے وقتاً فوقتاً کیا کہا اور کیوں کہا، ان کے اسلوب اظہار کی بعض نمایاں خوبیاں کیا رہیں؟''

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنی اس کتاب میں سب سے پہلے غالب کے فارسی قصائد کا تعارف کرایا ہے۔ غالب کے 13 فارسی قصیدے جو مختلف شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔ جن میں خاص شخصیات کے نام ہیں اسکوائر کالون، مٹکاف، لارڈ ہارڈنگ، نواب مصطفٰی خاں شیفتہ، نواب یوسف علی خاں، نواب کلب علی خاں، نواب واجد علی شاہ، بہادر شاہ ظفر وغیرہ تیرہ شخصی قصائد کے علاوہ مدحیات قصائد کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔ غالب کے فارسی قصائد کو حمد ستائش باری، نعت ومنقبت، ثنائے ارباب دولت اور تعریف احباب چار حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ حمد باری تعالیٰ کے تحت ایک قصیدہ، نعت مقبولؐ میں تین منقبت حضرت علیؓ میں پانچ قصیدے، حضرت امام حسین، عباس علمدار اور حضرت امام مہدی کے لیے ایک ایک قصیدہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے غالب کی قصیدہ نگاری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مرزا کے فارسی قصائد اپنی بہترین صورت میں مرزا کے لیے اظہار ذات اور فن کارانہ سطح پر اپنی تہذیبی شناخت کا بڑا ذریعہ ہیں جو الفاظ کے لبوں کو چھوتے ہیں اور نوائے سروش بن کر اس کی ''صریر خامہ'' کی لطیف ہیئت اختیار کرتے ہیں۔ ان کا تخلیقی سرچشمہ شاعر کے شعور سے زیادہ اس کے لاشعور میں ہوتا ہے۔ غالب کے قصائد کے مطالعے کے وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا

چاہیے تا کہ اس تخلیقی سر جوش کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے جس کا تعلق غالب کے فارسی قصائد سے ہے۔"

قصائد کے بعد کتاب میں فارسی قطعات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ شہزادہ مرزا نخرو کے لیے قطعہ، قطع در تہنیت شادی، قطعہ تہنیت بہ نظر گاہ بادشاہ اودھ، در تحسین گر بہ جیسے قطعات کا خصوصی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ در تحسین گر بہ میں غالب نے اپنی بلّی کی تعریف کی ہے۔ میر کا موازنہ کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ:

میر کے گھر پلی ہوئی ایک بلی کا دلی کی خواتین اور شریف زادوں جیسا کردار تھا جب کہ غالب اپنے گھر میں پلی ہوئی بلی کو ایسے کسی جیتے جاگتے کردار کے ساتھ پیش نہیں کر سکے۔

کتاب میں قطعات تاریخ کے عنوان کے تحت ان قطعات کا تعارف پیش کیا گیا ہے جو قطعات نگارش سے مزین ہیں ایسے 26 قطعات کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے اور وہ تاریخیں بھی درج کی گئی ہیں جو قطعات کے مادۂ تاریخ سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان میں بعض قطعات دو اشعار کے اور بعض تفصیلی ہیں۔ کتاب میں قطعات کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے چھٹے باب کا عنوان مزید کچھ تاریخی قطعات ہے جس کے تحت قطعۂ فتح در ضلع پنجاب، قطع در وایسرائے صاحب بہادر قطعہ در وفات تفضّل حسین خاں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ غالب کے فارسی تاریخی قطعات کے سلسلے میں مصنف کی رائے یہ ہے۔

"غالب کو اگر چہ تاریخ نگاری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، پھر بھی انھوں نے کافی تعداد میں اس نوع کے تاریخی قطعات اپنی فکری کاوشوں کی یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔ اگر چہ اپنے قصیدوں کی طرح کبھی وہ ان کے لیے داد طلب

نہ ہوئے جب کہ ان قطعات میں مرزا کے شعروشعور میں بعض اچھے نمونے بھی ملتے ہیں۔"

کتاب کا ساتواں باب غالب کی فارسی مثنویاں ہے۔ اس عنوان کے تحت مثنوی چراغ دیر، مثنوی باد مخالف، مثنوی سرمۂ بنیش، مثنوی دربارۂ امتناع نظیر خاتم النبیین، مثنوی درد داغ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دوسری اصناف کے مقابلے میں غالب کی فارسی مثنویاں زیادہ مقبول ہوئیں۔ مثنوی چراغ دیر کا نہ صرف ترجمہ ہوا ہے بلکہ اسے ڈرامے کی شکل میں پیش بھی کیا گیا ہے۔

کتاب کا آخری باب غالب کی فارسی شاعری غزلیات کا ہے۔ اور انتخاب گل رعنا کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے کلکتہ میں غالب اپنے آپ کو متعارف کرانا چاہتے تھے اس میں کچھ اشعار اردو کے اور کچھ فارسی کے شامل تھے۔ مصنف گل رعنا کا تعارف کراتے ہوئے بعض اشعار کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ غالب نے جو کچھ اپنی فارسی غزلوں میں کہا ہے یا قطعات میں جو شاعرانہ باتیں اور استادانہ انداز فکر و نگارش ان کی زبان یا زبان قلم پر آیا وہ ہندوستان کی فارسی شاعری کا بہت اچھا، نہایت اہم اور لائقِ تحسین نمونہ ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کی اس کتاب سے جو فارسی نہیں جانتے وہ غالب کی فارسی شاعری سے متعارف ہو سکتے ہیں۔ غالب کے پرستاروں اور غالب پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے یہ کتاب ہر اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے۔

●●●

ادبی سرگرمیاں

غالب اکیڈمی علمی، ادبی و ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں علمی ،ادبی و ثقافتی پروگرام منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ پروگرام نہ صرف غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقد کیے جاتے ہیں بلکہ دہلی کی مختلف انجمنیں بھی یہ پروگرام کرتی ہیں۔ غالب اکیڈمی ہر مہینے ایک ادبی نشست کا اہتمام کرتی ہے۔ ماہ نومبر کی ایک نشست کی مختصر رپورٹ پیش خدمت ہے۔

غالب اکیڈمی میں ماہانہ ادبی جلسے کا اہتمام

جس میں اردو کے مشہور افسانہ اور ناول نگار اردو ریسرچ ٹریننگ سینٹر، لکھنو کے پرنسپل جناب غضنفر علی نے اپنا نیا افسانہ تصویر تخت سلیمانی پیش کیا۔ اس افسانے پر ڈاکٹر مولا بخش نے سیر حاصل گفتگو کی۔ انہوں نے کہا کہ اس افسانے کی کئی جہتیں ہیں۔ ٹریٹ منٹ، موضوع اور اسلوب کے نقطۂ نظر سے ایک اہم اور منفرد افسانہ ہے۔ افسانے پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے پیغام آفاقی نے فرمایا کہ یہ افسانہ توجہ چاہتا ہے اس پر ٹھہر ٹھہر کر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک بار میں یہ پوری طرح نہیں کھلتا۔ انجم عثمانی نے افسانے کو بہت پسند کیا اور کہا کہ افسانے کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ فرحت

احساس نے کہا کہ غضنفر اس افسانے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس جلسے کی صدارت جناب کمال جعفری نے کی اور نسیم عباسی، اسد رضا، نگار عظیم، ظہیر برنی، فرحت احساس، مظہر الحق مخدومی، طالب زیدی، متین امروہوی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ منتخب اشعار پیش خدمت ہیں ۔

اپنے پڑوسیوں کو بھی پہچانتا نہیں   محصور اپنے خول میں اب فرد فرد ہے
(اسد رضا)

جستجو پہنچتی ہے نت نئے جہانوں میں   جی رہے ہیں ہم یارو جانے کن زمانوں میں
(نسیم عباسی)

یہ کس کی آنکھ ٹکی ہے اداس منظر پر   یہ کون ہے کہ جسے دیکھنے کی فرصت ہے
(غضنفر)

ہماری اپنی جنت اپنی دوزخ   ہمارے اپنے سب سودوزیاں ہیں
(طالب زیدی)

میں مسائل سے جنگ کرتا ہوں   زندگی دے گی کیا سزا مجھ کو
(کمال جعفری)

میں رونا چاہتا ہوں خوب رونا چاہتا ہوں   پھر اس کے بعد گہری نیند سونا چاہتا ہوں
(فرحت احساس)

دو قالب ایک جاں ہو کر اگر دنیا میں ہم رہتے   نہ کوئی مدعی ہوتا نہ کوئی مدعا ہوتا
(متین امروہوی)

غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام اردو ہندی کہانی کی ایک شام کا انعقاد

معاصر کہانیوں کے معیار مشکل اور پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ کہانی کا ابتدائی دور آسان تھا لیکن جیسے جیسے کہانی اپنے ارتقائی سفر کو طے کرتی گئی اس میں پیچیدگی آتی گئی۔ ان خیالات کا اظہار معروف افسانہ نگار پروفیسر جوگندر پال نے اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ پروفیسر جوگندر پال نے مزید کہا کہ اردو کہانی کا ماضی نہایت ہی سنہرا ہے اور مستقبل کافی روشن ہے اس لئے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے حقیقت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ حقیقت از خود کچھ نہیں ہوتی یہ ہر دور میں بدلتی رہتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اچھی کہانی وہ ہے جس میں کہانی کا احساس ہو لیکن کہانی کار کا احساس نہ ہو اور کہانی میں شعر کی لذت کا احساس ہو۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے اردو ہندی کہانی کے حوالے سے کہا کہ جہاں تک ملتی کی روایت ہے تو اردو میں یہ چیز بغاوت کی شکل میں شروع سے ہی موجود ہے اور یہی اس زبان کا اصل کردار ہے۔ اردو نے ظلم و زیادتی کے خلاف شروع سے آواز بلند کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی والوں کی ذمہ داری ہے کہ اردو کی اس روایت کو ختم نہ ہونے دیں کیونکہ یہ ذمہ داری صرف اردو والوں کی ہی نہیں ہے۔ ہندی کے ممتاز ادیب پروفیسر گنگا پرساد مل نے نئی ہندی کہانی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہندی کہانیوں کی جو روایت ہے اس میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ انھوں نے آزادی سے پہلے اور اس کے بعد کی کہانی پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اگر آزادی سے قبل کی کہانیوں میں آزادی کا جذبہ ملتا ہے تو آزادی کے بعد یہ جذبہ دوسری شکل میں سامنے آتا ہے اب لوگ اقتصادی، معاشی، رشتوں اور حقیقتوں کی آزادی پر زور دے رہے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے اردو کی نئی کہانی پر گفتگو کرتے ہوئے

کہا کہ آج اس ترقی یافتہ دور میں زندگی بد سے بدتر ہو چکی ہے۔ انسانی اقدار بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج کی کہانی تین طرح سے سامنے آتی ہے۔ پہلا رجحان یہ ہے کہ آج کی کہانی حقیقت کو قبول کرتی ہے۔ دوسرا رجحان یہ ہے کہ آج کا کہانی کار حقیقت کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور تیسرا رجحان یہ ہے کہ جو نہیں ہے اسے حقیقت کی طرح پیش کرنا گویا حقیقت کا مقابلہ کرنے والا رجحان۔ لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ کہانی کس طرح پیش کی جا رہی ہے سوال یہ ہے کہ ان کہانیوں میں فن کو کس طرح برتا گیا ہے۔ اس موقع پر پروفیسر گنگا پرساد ومل نے کھوئی ہوئی تعویز، رتن سنگھ نے سون چڑی، طارق چھتاری نے بندوق، ڈاکٹر نگار عظیم نے مردار اور ڈاکٹر خالد جاوید نے مٹی کا تعقب کہانی پڑھ کر سنائی۔ پروگرام کی نظامت غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کی۔ اس موقع پر این سی پی یو ایل کے اشتراک سے غالب اکیڈمی میں چلائے جا رہے کمپیوٹر کورس میں رحمت اللہ (پہلی پورزیشن)، محمد مہتاب (دوسری پوزیشن) اور پروین افروز (تیسری پوزیشن) کو ڈاکٹر علی جاوید نے اپنے ہاتھوں سے سند اور انعامات پیش کئے۔ علاوہ ازیں پروفیسر جوگندر پال نے دیگر طلباء و طالبات کو اسناد پیش کیں۔ پروگرام کے شروع میں متین امروہوی نے استقبالیہ نظم پڑھی۔

●●●

مطبوعات غالب اکیڈمی

	نام کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
-1	دیوان غالب (ہندی)	غالب اکیڈمی	75/-
-2	دیوان غالب عام ایڈیشن	غالب اکیڈمی	60/-
-3	غالب شناس مالک رام	گیان چند جین	90/-
-4	شرح دیوان غالب	ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد علیگ	250/-
-5	تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	35/-
-6	فیضان غالب	عرش ملسیانی	22/-
-7	غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/-
-8	تصورات غالب	محمد عزیز حسن	35/-
-9	انشائے مومن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	25/-
-10	مومن شخصیت اور فن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	300/-
-11	ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
-12	نوائے سروش (انگریزی)	غالب اکیڈمی	40/-
-13	اقبال/مضامین مقالات	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
-14	جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان	پروفیسر محمد حسن	75/-
-15	رقص شرر	انّ میری شمل (قاضی افضال حسین)	90/-
-16	اردو غزل کے اہم موڑ	شمس الرحمٰن فاروقی	150/-
-17	تلمیحات غالب	محمود نیازی	90/-
-18	جہات غالب	ڈاکٹر عقیل احمد	200/-
-19	غالب کی سوانح عمری	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	250/-
-20	دیوان غالب ڈیلکس (تین رنگوں میں)	غالب اکیڈمی	150/-

JAHAN-E-GHALIB
Half Yearly

R N I No. DEL /URD/2005/17310
Vol. 3 Issue 5
Dec., 2007 - May 2008

غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالحمیدؒ کی پیدائش کا سواں سال

Printed by Dr. Aqil Ahmad , published by Dr. Aqil Ahmad on behalf of
Ghalib Academy and Printed at M.R. Printers, 2818, Gali Garhiyya,
Darya Ganj, New Delhi, Published from Ghalib Academy, 168/1, Basti Hazrat Nizamuddin,
New Delhi-110013, Editor Dr. Aqil Ahmad